پروفیسر فضل امام
ادبی سفر کے ساٹھ سال
مرتبہ
ڈاکٹر شبیہ صغرا

پروفیسر فضل امام

ادبی سفر کے ساٹھ سال

مرتبہ

ڈاکٹر شبیہ صغرا

نام کتاب	:	پروفیسر فضلِ امام: ادبی سفر کے ساٹھ سال
مرتبہ	:	ڈاکٹر شبیہ صغرا
ناشر	:	ڈاکٹر شبیہ صغرا
پتہ	:	دانش کدہ، موضع وڈاک خانہ مچھلی گاؤں، ضلع امبیڈکر نگر
موبائل نمبر	:	09452057786
سن اشاعت	:	۲۰۱۵ء
تعداد	:	۴۰۰ (چارسو)
کمپوزنگ	:	محمد رافق
طباعت	:	امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ یو پی
قیمت	:	-/۳۰۰ روپے (Rs. 300/-)

ملنے کے پتے

۱۔ پروفیسر سید فضل امام۔ مکان نمبر 451/203 امامیہ مارگ،
جعفریہ کالونی، مفتی گنج، لکھنؤ-003 226

۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۳۔ دانش محل، جھنڈے والا پارک، امین آباد لکھنؤ

۴۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۵۔ اقصیٰ پبلک لائبریری، چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ

Prof. Fazl-e-Imam
Adabi Safar ke Sath Saal
Edited By : Dr. Shabih Sughra, D.Phil
First Edition : 2015 Rs. 300/-

انتساب

معنیٔ لفظ آدمیت، پیکرِ ایثار وفدا کاری

محترم المقام عالی جناب

سید انوار الحسن کربلائی صاحب مرحوم ومغفور

کے

نام

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

بزم مشاورت

ڈاکٹر عابدہ آفریدی

ڈاکٹر کوثر عالیہ

ڈاکٹر ناصرہ بصری

ڈاکٹر نازش خلیل

ڈاکٹر خورشید فاطمہ

شبانہ انجم

نازیہ عرشی

فہرستِ عنوانات

نمبر شمار	عنوانات		صفحہ نمبر
الف	انتساب		۳
ب	بزم مشاورت		۴
ج	عرضِ مرتب		۸
د	احوال وکوائف		۱۲
	باب تاثر نہ کہ تنقید		
۱	ڈاکٹر فضل امام کی شخصیت	محمد ہارون	۱۸
۲	ڈاکٹر فضل امام ایک تعارف	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی	۲۳
۳	پروفیسر فضل امام: مختصر تعارف	نازیہ عرشی	۳۵
۴	پروفیسر فضل امام: حیات وشخصیت	نازش خلیل	۴۷
۵	پروفیسر فضل امام: مشترکہ تہذیب	ڈاکٹر کلثوم فاطمہ	۶۱

۶	پروفیسر فضل امام اور الہ آباد	ڈاکٹر احسان حسن	۶۴
۷	پروفیسر فضل امام بحیثیت خطیب	مولانا سید شمس الحسن	۶۹
۸	بے مثال استاد محترم	ڈاکٹر حیدر علی خاں	۷۲
۹	فضل امام یعنی کرپارام	پروفیسر علی احمد فاطمی	۷۴
۱۰	میری یادوں کے آئینے میں	خداداد خاں مونس	۸۶
۱۱	بے مثال شاگرد و باکمال استاد	ڈاکٹر غلام حسین	۹۳
۱۲	پروفیسر فضل امام کی تنقیدی بصیرت	ڈاکٹر رضی الرحمٰن	۹۹
	باب انتقادیات		
۱۳	پروفیسر سید فضل امام ترقی پسند نقاد	پروفیسر سید محمد عقیل رضوی	۱۰۹
۱۴	پروفیسر فضل امام بحیثیت نقاد	ش۔ک۔ نظام	۱۱۴
۱۵	سنجیدہ اور متوازن انیس شناس	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۱۳۴
۱۶	معتقدِ ابوالکلام	ڈاکٹر ریحان حسن	۱۴۰
۱۷	پروفیسر فضل امام مستند ناقدین کی نظر میں	خوشتر مکرانوی	۱۴۶
۱۸	ڈاکٹر فضل امام کے علمی و ادبی کارنامے۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۱۵۴
۱۹	پروفیسر فضل امام بحیثیت ناقد	ڈاکٹر رضوان انصاری	۱۵۶
۲۰	پروفیسر فضل امام کا تنقیدی شعور و وقوف	ڈاکٹر شاداب قدیر	۱۷۶
۲۱	پروفیسر فضل امام بحیثیت انیس شناس	ڈاکٹر عباس رضا نیر	۱۸۴
۲۲	پروفیسر فضل امام کی انتقادی بصیرت	ڈاکٹر ارشد رضوی	۱۹۶

	تخلیقی عمل		
۲۳	پروفیسر فضل امام بحیثیت شاعر	ڈاکٹر نزلیش	۲۰۹
۲۴	پروفیسر فضل امام کی غزل گوئی	ڈاکٹر عابدہ آفریدی	۲۱۱
۲۵	پروفیسر امام کی قطعہ نگاری	ڈاکٹر کوثر عالیہ	۲۲۲
۲۶	امعان نظر	شیخ شبانہ انجم	۲۲۷
۲۷	پروفیسر فضل امام کی چند نثری نظمیں	ڈاکٹر خورشید فاطمہ	۲۳۴
۲۸	پروفیسر فضل امام کے چند منتخب مضامین		
۲۹	اتحاد بین المسلمین وقت کی اہم ضرورت		۲۶۵
۳۰	کلامِ اقبال میں تصورِ نساء		۲۷۲
۳۱	اقبال کا مردِ مومن		۲۸۳
۳۲	جوش کا عقیدۂ مذہب		۲۹۹
۳۳	مقدمہ انتخاب کلیاتِ جوشؔ		۳۱۱
۳۴	منظومات (ہدیۂ تہنیت)		۳۲۶
۳۵	بسملؔ سعیدی، پروفیسر احمد محفوظ، شاداب قدیر، طیب علی کاظمی، نایاب سحرؔ		۳۲۴ ۳۳۴

عرض مرتب

پروفیسر فضل امام کا نام نامی اسم گرامی دنیائے علم وادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کے ساٹھ سال پورے کرلئے ہیں۔ وہ ایسے صاحب اسلوب ہیں کہ جن کی شناخت بہت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی شہ پارے اردو دنیا میں قدر و قیمت کے مالک ہیں۔ موصوف کی نگرانی میں پچیس سے زیادہ ریسرچ اسکالرس نے پی، ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ فل کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند نقاد اور ادیب ہیں لیکن سکہ بند موقف سے علاحدہ سوچنے اور پرکھنے کے عادی ہیں اور انتہا پسندی کو مناسب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ وہ اپنی فکری بصیرت کو بہر طور ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اور کسی طرح کی مفاہمت نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انتقادی نظریہ موضوع کے پیش نظر واضح اور غیر مبہم رہتا ہے۔ انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے جس سے عہد حاضر کے بہت سے اساتذہ فیض یاب ہوکر درس وتدریس کے فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر فضل امام کی تنقیدوں میں افراط وتفریط نہیں ہے لیکن مغربی انتقاد سے مرعوب ناقدوں پر وہ بھرپور تبصرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی تنقیدوں میں محتاط روی، دوررسی اور حق شناسی نظر آتی ہے وہ قدیم اور جدید تنقید کے ساتھ فارسی،

عربی، سنسکرت اور ہندی تنقید سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ان تمام تنقیدی رویوں سے اپنی تنقید نگاری کو منفرد بناتے ہیں۔ وہ تنقید اور تخلیق میں کسی طرح کی عصبیت کو غیر اخلاقی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک اچھی اور اعلا تخلیق کو بھی اعلا تنقید کا نمونہ قرار دیتے ہیں اور اچھی تنقید کو تخلیق کا درجہ دیتے ہیں۔

صاحبو!

ترتیب، تدوین اور انتخاب کا کام مشکل ہوتا ہے اور کسی ایسی شخص کے باب میں بہت مشکل ہو جاتا ہے جس کی شخصیت کی کئی مقناطیسی جہتیں ہوں۔ پروفیسر سید فضل امام رضوی ایک معتبر دوررس محقق، مصنف، نقاد، شاعر اور خطیب کے علاوہ سماجی فلاح و بہبود کے اہم ستون ہیں۔

راقم السطور نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ موصوف کی شخصیت کے اہم گوشے حیطۂ تحریر میں آجائیں۔ اُردو کے مقتدر اہل علم حضرات اور مستند شعرائے کرام نے از راہِ نوازش اپنی نگارشات سے اس کتاب کو معتبر بنا دیا ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی کی زندگی کا ایک بڑا اور اہم حصہ شعبۂ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور میں گزرا ہے۔ جہاں وہ نومبر ۱۹۷۳ء سے اپریل ۱۹۸۶ء تک تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ دوبارہ وہ شعبۂ اردو و فارسی کی صدارت پر بھی فائز رہے۔ وہاں کی صوبائی انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کے فرائض بھی بخوبی انجام دئے ہیں۔ ان کی ذات گرامی قدر سے پورے صوبے میں شعبۂ اردو و فارسی کی قابل قدر شناخت قائم ہوئی تھی۔ صوبے کی ہندی اور اردو انجمنوں کے کوئی بھی پروگرام بغیر ان کی شمولیت کے مکمل نہیں تسلیم کئے جاتے تھے۔ آج بھی اہل راجستھان ان کی یادوں کے چراغ قلب ونظر میں سجائے ہوئے ہیں جس کا اندازہ طوطی خواجہ اجمیری جناب خداداد خاں مونس کے مضمون سے بخوبی ہو جائے گا۔

موصوف کے یہاں مذہبی اور مسلکی تنگ نظری اور تعصب کی کوئی جگہ نہیں ہے وہ راجستھان یونیورسٹی جے پور کے ٹیچرس ہوسٹل میں تنہا مسلمان تھے اور سبھی غیر مسلم حضرات ان کے اخلاق حمیدہ کے قصیدہ خواں رہے۔ ان کی محبت، خلوص اور یگانگت کا اعتراف بھی صمیم قلب سے کرتے ہیں۔

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں بھی ان کا قیام یونیورسٹی کے بنگلے میں رہا۔ ان کے اردگرد بھی غیر مسلم اساتذہ کی قیام گاہ رہی لیکن ان کے سب سے محبت اور یگانگت کے تعلقات رہے۔ پروفیسر فضل امام رضوی کی ہردل عزیزی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ الہ آباد یونیورسٹی اساتذہ یونین کے اس وقت صدر منتخب ہوئے جب کہ پورا ہندوستان ۱۹۹۲ء کی بابری مسجد کی شہادت کے بعد جل رہا تھا۔ موصوف کے مقابل جتنے پروفیسر حضرات تھے ان کی پشت پر یونیورسٹی اور شہر کا وہ پورا طبقہ سرگرم عمل تھا جن کا تعلق عصبیت کے کارخانے سے تھا۔ مگر پروفیسر فضل امام رضوی نے ان سب کو شکست فاش دی اور ان کی کامیابی کا اعلان بی بی سی نے اسی روز شام کے بلیٹن میں بڑے فخریہ انداز سے کیا۔ وہ شعبۂ ہندی اور سنسکرت میں بھی اپنی ہندی دانی اور سنسکرت دانی کی وجہ سے کافی مقبول اور مشہور رہے۔ اس بات کا اندازہ پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے مضمون سے بخوبی ہو جائے گا ان کی سنسکرت اور ہندی کا اعتراف یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد بھی کرتے رہے اسی لئے انھیں فضل امام یعنی کرپارام بھی کہا جاتا رہا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے تاریخی وجیانگرم ہال میں، سوامی سوروپانند سرسوتی کے استقبالیہ میں ان کی ہندی اور سنسکرت آمیز تقریر کی گونج آج تک یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء میں ہے۔

حکومت اتر پردیش نے پروفیسر فضل امام کو اتر پردیش سکنڈری ایجوکیشن کا چیرمین بنا کر اسٹیٹ منسٹر کا درجہ دیا مگر ان کی قناعت، سادگی اور درویشی میں کوئی

تغیر نہ آسکا۔ وہ اسی طرح تن بہ تقدیر رہے اور ان کی شرافت نفسی اور شرافت علمی کے جوہر نمایاں رہے۔

ہندی ساہتیہ سمیلن، پریاگ نے انھیں ہندی کی اعزازی سند ''وِدیاواچسپتی'' (विधावाचस्पति) جو ڈی۔لٹ کے مساوی ہے تفویض کی تو اکھل بھارتیہ بھوج پوری پریشد نے انھیں ''بھوج پوری بھاسکر'' (भोजपुरी भास्कर) سے نوازا۔ اکھل بھارتیہ بھاشا سنگم بھوپال نے انھیں ''ساہتیہ بھوشن'' (साहित्य भूषण) کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

''بھوج پوری کا تعارف مع مختصر تاریخ'' ''راجستھانی زبان و ادب کی مختصر تاریخ'' لکھ کر انھوں نے لسانی اتحاد و اتفاق کی راہیں ہموار کیں ان کتابوں کو اکادمیوں نے انعام سے بھی نوازا۔

مختصر یہ کہ پروفیسر فضل امام کی شخصیت کی اتنی علمی و ادبی اور سماجی جہتیں ہیں کہ جس پر جتنی خامہ فرسائی کی جائے وہ کم ہے۔ اس کا اندازہ اس حقیر کاوش میں اکابرین اردو ادب کی آراء سے واضح ہو جائے گا۔ احوال و کوائف کے ذیل میں بہت اختصار سے اطلاعات تحریر کی گئی ہیں۔

میں اس کتاب میں شامل محترم مضمون نگاروں اور شعرائے کرام کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں جنھوں نے اپنے گراں قدر افکار سے نوازنے کی زحمت فرمائی ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر ڈاکٹر مخمور کاکوروی کا شکریہ نہ ادا کروں جن کی مساعی جمیلہ سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آسکی ہے۔ ہاں! اس مختصر کاوش میں ''ڈاکٹر فضل امام ایک مطالعہ'' از خوشتر مکرانوی کے بھی کچھ حصے شامل کئے گئے ہیں۔

فقط

مخلص

(ڈاکٹر) شبیہ صغرا

احوال وکوائف

شاہ ابوالحسن کی تاریخ آئینۂ اودھ کے مطابق پروفیسر فضل امام رضوری کے مورث اعلاحضرت سید جمال الدین عہد تغلق میں ہندوستان وارد ہوئے اور قاضی القفاۃ (Chief Justice Of India) کے عہدے پر مامور ہوئے۔ بعد میں ان کی ذریت ضلع اعظم گڑھ کے موضع سید پور بیسکھا میں آباد ہوئی۔ جو آج بھی حویلی کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن اب سنت محبوب الہٰی کی اتباع میں ترک وطن کر کے ضلع جون پور، ضلع غازی پور، ضلع فیض آباد، ضلع امبیڈکر نگر وغیرہ میں آباد ہیں۔ کچھ افراد آج بھی سید پور میں جو "حویلی" کے نام سے موسوم ہے، رہ رہے ہیں۔ ان کے خاندان میں علمائے کرام ہر دور میں رہے ہیں۔ آج بھی اس خانوادے کے افراد دنیائے علم وادب میں سرگرم عمل ہیں۔

نام	:	سید فضل امام رضوی
والد ماجد	:	عالی جناب سید مشتاق حسین مرحوم ومغفور،
تاریخ پیدائش	:	۷/اگست ۱۹۴۰ء
جائے پیدائش	:	موضع بہاء الدین پور، ضلع اعظم گڑھ
والدہ ماجدہ	:	خورشید النساء بی بی مرحومہ ذاکرۂ اہل بیت
تعلیم	:	ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ، منشی کامل، فاضل ساہتیہ رتن، وِدّیا واچسپتی (ہندی سنسکرت)

اہلیہ : شمیم فاطمہ صاحب بنت سید انوار الحسن کربلائی۔ مچھلی گاؤں ضلع فیض آباد، امبیڈکر نگر

اولادیں : ڈاکٹر سید ذاکر امام، دانش پرنسپل۔ سید باقر امام سینئر سیلس منیجر، قارب امام عابد، ڈاکٹر خورشید فاطمہ، شبیہ فاطمہ، صبیح فاطمہ، سبیکہ فاطمہ (خیزران)

درسی، تدریسی اور انتظامی زندگی:۔

ایس۔این انٹر کالج، اندئی پور ضلع فیض آباد

سابق صدر شعبۂ اردو، ایم۔ایل کے کالج، بلرام پور، گونڈہ

سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی جے پور

سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

سابق چیرمین، اتر پردیش سکنڈری ایجوکیشن کمیشن (اسٹیٹ منسٹر کا درجہ)

سابق صدر، الہ آباد یونیورسٹی اساتذہ یونین (AUTA)

سابق نائب صدر دوبار انجمن وظیفہ سادات و مومنین

پرووسٹ، سر سندر لال ہال، الہ آباد یونیورسٹی

سابق چیف پراکٹر، الہ آباد یونیورسٹی

سابق آنریری لائبریرین الہ آباد یونیورسٹی سنٹرل لائبریری

سابق صدر، سمنویہ آل انڈیا سمتی

سابق نائب صدر، ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد

سابق ممبر ریسرچ اور نصابی کمیٹی، گورکھپور یونیورسٹی، اودھ یونیورسٹی، بندیل کھنڈ، روہیل کھنڈ، کان پور، دہلی یونیورسٹی اودے پور یونیورسٹی، کاشی ودیا پیٹھ وغیرہ۔

سابق کنوینر...... آل انڈیا ریڈیو مشاورتی بورڈ، الہ آباد

سابق مدیر، سہ ماہی نخلستان، راجستھان اردو اکاڈمی، جے پور

مدیر ماہنامہ وظیفہ، انجمن وظیفہ سادات ومومنین، علی گڑھ

اودھ رتن	اودھی سماج، فیض آباد
بھوج پوری بھاسکر	اکھل بھارتیہ بھوج پوری پریشد
ساہتیہ بھوشن،	اکھل بھارتیہ بھاشا سنستھان، بھوپال

سفر بیرون ملک

لندن، سنگاپور، پاکستان

مکہ معظمہ مدینہ منورہ عراق شام ایران ابوظہبی دُبئی

اعزاز وانعام

بہار اُردو اکاڈمی اوارڈ	بھوج پوری ادب کا تعارف
اُتر پردیش اُردو اکاڈمی اوارڈ	امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری
	افکار ونظریات
	دیوان درد کا نقش اوّل
	تنقیدی معیار
	مشرقی تنقید
	امعانِ نظر
	انیس: شخصیت اورفن
	راجستھانی زبان وادب کا تعارف
	جدید مرثیہ (ایک اجمالی جائزہ)
مغربی بنگال اردو اکاڈمی اوارڈ	انیس شخصیت اورفن

زیر اشاعت:

کلیات میکش اکبرآبادی　　:　　نیشنل کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی

نقدالادب　(مشرقی انتقادیات کے تناظر میں)

درج ذیل ریسرچ اسکالرس نے پروفیسر فضل امام رضوی کی نگرانی میں پی۔ ایچ ڈی، کی اسناد حاصل کیں

شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

۱۔ ڈاکٹر روشن اختر کاظمی۔ ''اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت''

۲۔ ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی۔ ''فرہنگ کلیات میر: تدوین و ترتیب''

۳۔ ڈاکٹر عابدہ آفریدی۔ ''اردو قطعات نگاری''

۴۔ ڈاکٹر فیروز بیگ۔ ''ریاست ٹونک کی شعری خدمات''

۵۔ ڈاکٹر کوثر عالیہ۔ ''ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی حیات اور خدمات''

۶۔ ڈاکٹر کلیم قیصر۔ ''اردو غزل کا سماجیاتی مطالعہ''

۷۔ ڈاکٹر ناصرہ بصری۔ ''بصر ٹونکی کی تاریخ گوئی''

۸۔ ڈاکٹر حسن آرا ''مولوی سلیم الدین تسلیم حیات اور شاعری

کان پور یونیورسٹی

ڈاکٹر ظہیر محمد۔ ''حرمت الاکرام: حیات اور شاعری''

درج ذیل ریسرچ اسکالرس نے پروفیسر فضل امام رضوی کی نگرانی میں شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد سے ڈی۔ فل کی ڈگریاں حاصل کیں

۱۔ ڈاکٹر رضوانہ خانم۔ ''اردو افسانوں میں اشتراکی رجحانات''

۲۔ ڈاکٹر شمشاد حیدر زیدی	اردو مرثیہ کے اسالیب
۳۔ ڈاکٹر افسر فاطمہ عابدی	اردو ناولٹ
۴۔ ڈاکٹر جمال شبیر	جوش ملیح آبادی
۵۔ ڈاکٹر زینت آرا	قصبہ جائس کی شعری و ادبی خدمات
۶۔ ڈاکٹر حیدر علی خاں	راہی معصوم رضا
۷۔ ڈاکٹر شگفتہ نہال	فراق گورکھپوری
۸۔ ڈاکٹر احسان حسن	کیفی اعظمی
۹۔ ڈاکٹر محمد تواب	ترقی پسند تنقید
۱۰۔ ڈاکٹر ناصرہ	تلامذۂ میر انیس
۱۱۔ ڈاکٹر شاداب قدیر	فیض احمد فیض
۱۲۔ ڈاکٹر کہکشاں صفی	گوپی چند نارنگ

۱۳۔ڈاکٹر عبدالندیم		سردار جعفری

۱۴۔ڈاکٹر کلثوم فاطمہ		اسالیب نثر

۱۵۔ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی		کلام انیس میں اخلاقی اقدار

جن کے مقالے زیر تسوید ہیں

۱۔شیخ شبانہ انجم		رتن سنگھ کی افسانہ نگاری

۲۔نازیہ عرشی		رضیہ سجاد ظہیر

محمد ہارون
ایم اے، بی ایڈ
مکرانہ

ڈاکٹر فضل امام کی شخصیت

آج کا دن اہلِ مکرانہ اور بزمِ فروغِ اُردو ادب (رجسٹرڈ) کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ جشن ڈاکٹر فضل امام کا انعقاد کر رہے ہیں۔

حضرات! اُردو کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ اس کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق ہے یہ ہماری مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا ایک ایسا لسانی ورثہ ہے، جو تاریخ کی کروٹوں نے ہمیں بخشا ہے۔ بزمِ فروغِ اُردو ادب مکرانہ ایک خالص علمی و ادبی انجمن ہے۔ اس نے مارواڑ کے علاقہ میں اُردو زبان و ادب کے تحفظ اور بقا کی کوشش جاری رکھی ہے۔ یہ جشن بھی اسی جذبہ کے تحت منعقد کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ''جو قوم اپنے دانشوروں کو عزت نہیں بخشتی اس قوم کی تمدنی اور ثقافتی ترقی ہرگز ممکن نہیں اور جس قوم کی تمدنی اور تہذیبی ترقی رک جاتی ہے اُس کی معاشرتی و سیاسی حیثیت بھی قائم نہیں رہ سکتی۔'' ......دانشوروں اور مفکروں کے اقوال، تصنیف و تالیف، جذبات و احساسات سے ملک کے عوام و خواص میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور اسی سے قوم میں معاشرتی اور صحت مند سیاسی شعور کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ سیاسی افراد اور نام نہاد نیم جمہوری نظام کے تحت منتخب رہنمایانِ ملک و قوم ایک ڈرامائی انداز سے آتے اور چلے جاتے ہیں،

لیکن ایک اعلیٰ فنکار اور ادیب جس طرح سے ملک وقوم کی زندگی پر اپنے علم وفن کے نقوش چھوڑ جاتا ہے اُس پر ماضی، حال اور مستقبل کی تاریخ فخر ومباہات کرتی ہے انتہائی مسرت ہے کہ اسی نقطۂ نظر کے پیش نظر اہل مکرانہ اور بزم فروغ اُردو ادب نے اس تقریب سعید کو عملی جاما پہنایا۔ صاحب جشن ڈاکٹر فضل امام صاحب اتر پردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے موضع بہاء الدین پور میں مورخہ ۷؍ اگست ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم وادب سے بہرہ ور تھا۔ ان کے والد ماجد جناب سید مشتاق حسین رضوی صاحب اردو، فارسی کی اچھی استعداد رکھتے ہیں ان کی والدۂ ماجدہ بھی اردو و فارسی کی معقول تعلیم حاصل کیے ہوئے تھیں۔ ڈاکٹر فضل امام کے چچا جناب مولوی سید اقبال حسین رضوی عالم وادیب تھے۔ اردو، فارسی اور عربی کی اچھی استعداد رکھتے تھے اور اقبالؔ تخلص رکھتے تھے اردو و فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔

ڈاکٹر فضل امام کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والدہ کی نگرانی میں شروع ہوئی اور عربی مدارس میں بھی داخل کیے گئے لیکن بہت جلد وہاں سے علیحدہ ہو گئے اور انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کو شعر وادب کا ابتدا سے ہی شغف تھا لہٰذا کبھی کبھار شعر موزوں کر لیا کرتے تھے اور ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے شعری وادبی نشستوں اور مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔ اسی عہد میں مضامین اور مقالات بھی لکھنے شروع کر دئے تھے جو ملک کے مقتدر رسائل، جرائد اور اخبارات میں وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ اور جونپور میں ہوئی بعد میں ایم۔ اے (اردو) میں اول درجہ اور اول پوزیشن میں حاصل کی۔ اس کے علاوہ منشی کامل (فارسی) اور عالم (عربی) کی سند عربی مدارس سے پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ پی، ایچ، ڈی۔ اور

ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں گورکھپور یونیورسٹی سے مایۂ ناز محقق و نقاد پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر حاصل کیں۔ آپ پورے راجستھان میں اردو کے پہلے ڈی۔لٹ ہیں۔ ہندی زبان وادب پر بھی آپ کی گہری نظر ہے چنانچہ ہندی میں ساہتیہ رتن کی سند بھی آپ نے حاصل کی اور ہندی زبان میں گراں قدر مقالے اور کتابیں لکھی ہیں جو ملک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام ایک بلند پایا اُستاد ہونے کے ساتھ ایک خوش فکر شاعر، متوازن نقاد، مستند ادیب اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ اعظم گڑھ، جونپور، فیض آباد، لکھنؤ، علی گڑھ، گورکھپور کی علمی و ادبی فضا میں آپ نکہت و نور بن کر چھائے رہے اور اب راجستھان کی سرزمین پر علم وادب کی ضو پاشیاں کر رہے ہیں۔

کسی ادیب کا قول ہے کہ..... "کچھ انسان پیدائشی عظیم ہوتے ہیں، کچھ محنت اور لگن سے عظیم انسان بن جاتے ہیں، اور کچھ پر عظمت تھوپ دی جاتی ہے۔" ڈاکٹر فضل امام محنت، ریاضت اور جاں سوزی سے صاحب عظمت ہوئے ہیں۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں غرق رہتے ہیں اور بہ یک وقت کئی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں اور جہاں وہ تحریر کے دھنی ہیں وہیں تقریر کے بھی عنوان جلی ہیں۔ شعر وداب کے مختلف موضوعات پر تو آپ علم وادب کے دریا بہاتے ہی ہیں لیکن سیرت پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور شہید کرب وبلا حضرت امام حسینؓ کے مقصد شہادت پر بھی آپ جب جنبش لب سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک دریا ہے جسے اذن روانی مل گیا ہے جس سے آپ کی تاریخ اسلام اور دیگر ادیان کی تاریخ کے اتھاہ اور تقابلی مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان بھر میں اپنی تقریر کی سحر کاری کے باعث مقبول ہیں۔ خشک سے خشک موضوع کو بھی وہ اپنے دلکش انداز تقریر سے دلچسپ بنا دیتے ہیں اور مجمع وجد

کرنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام نہایت مخلص، ذہین، ملنسار، فیاض، ہمدرد اور رحم دل ہیں۔آپ جب بھی کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتے ہیں تو صرف رسمی مزاج پرسی سے ہی مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ اس کے علاج اور معالجے میں پیش آنے والی دشواریوں کو بھی دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور کچھ اس انداز سے مریض کی مالی امداد بھی (اگر مستحق امداد ہو) فرما دیتے ہیں کہ مریض اور اس کے اعزا کو شرمندہ نہیں ہونا پڑے احباب اور مستحق طالب علموں کی اعانت کرنا وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

آپ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے ہیں ہمیشہ چہرے پر مسکراہٹ پھیلی رہتی ہے۔دشواریوں اور پریشانیوں میں بھی زیرلب تبسم ریز رہتے ہیں۔سبھی سے انتہائی انکسار سے ملتے ہیں لیکن جب کوئی ان کے شعور کو ٹھیس پہنچاتا ہے تو وہاں وہ غرور کو عبادت کے درجے میں داخل کر دیتے ہیں اور اپنے علمی اور ادبی وقار کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔وہ عالم خفگی میں بھی چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہ پاتے اور اکثر جس سے خفا ہو جاتے ہیں، خود ہی رام بھی کر لیتے ہیں۔حق گوئی و بیباکی کے باعث وہ اہلِ خلوص میں کافی موقر ہیں۔یہ ان کی شخصیت کی بنیادی صفت ہے۔

ڈاکٹر فضل امام کی ذات سے راجستھان کے شعر و ادب کو عظمت اور وقار حاصل ہوا ہے۔صوبے کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو بھی شعور حاصل ہوا ہے آپ کتب تاریخ، تحقیق اور تنقید کے حوالے اس طرح رواں دواں دیتے ہیں جیسے سبھی چیزیں اُن کے صفحات اور ایڈیشن حفظ ہوں۔آپ کی قوت حافظہ بڑے غضب کی ہے۔آپ کی نگرانی میں دو طالب علموں نے پی،ایچ،ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔آپ اپنی وقیع اور گراں قدر تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کے باعث ہندوستان اور پاکستان میں ایک

مستند اہل قلم تسلیم کئے جاتے ہیں اور ملک میں منعقد ہونے والے بھی اہم ادبی جلسوں، کانفرنسوں اور مذاکروں میں آپ کی شمولیت کامیابی کی ضمانت تسلیم کی جاتی ہے۔

گذشتہ سال آپ اس بزم کا افتتاح کرنے تشریف لائے تھے اور امسال آپ کے گراں قدر علمی وادبی کارناموں کو سراہنے کے لئے اس جشن سعید کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں اس شعر پر اس مختصر مضمون کو ختم کر رہا ہوں۔

کتنے عظیم لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

ڈاکٹر فضل امام عظمتوں کے اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں کہ جو ایک بار ان سے خلوص قلب سے مل لیتا ہے وہ انھیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ شخصیت میں یہ مقناطیسیت بڑی بات ہے۔ [1]

[1] ڈاکٹر فضلِ امام۔ ایک مطالعہ سے ماخوذ

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی

ڈاکٹر فضل امام.....ایک تعارف

ڈاکٹر فضل امام کا نام راجستھان کے اُن ادیبوں میں بلا تامل لیا جا سکتا ہے جنھوں نے باہر سے آکر صوبے کے مختلف شہروں میں شعروادب کے چراغ کی لَو کو تیز تر کیا بلکہ اپنی تخلیقات، تصنیفات اور تالیفات کے ذریعہ علم وادب کی دنیا میں اس صوبے کے نام کو روشن کیا۔ راجستھان کی تشکیل سے قبل یہ صوبہ مختلف خودمختار دیسی ریاستوں میں منقسم تھا جہاں بعض مقامات پر چھوٹے چھوٹے ادبی گہوارے بھی بن گئے تھے۔ ان میں ریاست جے پور کو نمایاں حیثیت حاصل تھی جہاں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے اردو شعروادب کا رواج ہو چکا تھا اور ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد دہلی اور دوسرے مقامات کے اصحاب علم وفن کی آمد کے باعث شعروادب کو ایسا فروغ حاصل ہوا کہ جے پور ایک ادبی گہوارہ بن گیا جس کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''دوسری دلّی'' کے نام سے منسوب کیا۔ اصحاب علم وفضل کی باہر سے آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا اور شعروادب کا یہ گہوارہ فروغ پاتا رہا۔

تشکیل راجستھان کے بعد جے پور ریاست کی انفرادی حیثیت ختم ہو گئی تاہم صوبے کی راجدھانی کی حیثیت سے اس کی اہمیت قائم رہی اور باہر سے آنے والے ارباب علم وادب کا سلسلہ جاری رہا۔ شروع میں یہاں بھی دوسرے مقامات کی طرح اُردو زبان وادب پر انقلاب زمانہ اور حادثات وقت کا اتنا اثر پڑا کہ کچھ عرصے

کے لئے جے پور کی ادبی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور ادبی فضا پر جمود و تعطل کے بادل چھائے ہوئے نظر آنے لگے مگر یہ کیفیت دیر پا نہ تھی۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک نئی فضا تیار ہونے لگی جس نے شعر و سخن سے دلچسپی کے ساتھ اردو تعلیم کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی۔ اردو تعلیم کا سلسلہ پرائمری درجات سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ اعلیٰ تعلیم تک پہنچ گیا۔ چانچہ ۱۹۷۲ء میں اُدے پور یونیورسٹی میں اور پھر ۱۹۷۳ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور میں اردو میں ایم۔اے کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل جے پور، اُدے پور، اجمیر، ٹونک، سیکر اور کوٹہ میں بی۔اے کی سطح تک ہی اردو تعلیم کی سہولت فراہم تھی۔ اردو میں ایم۔اے کرنے کے لیے راجستھان کے طالب علم دوسری یونیورسٹیوں میں جانے کے لیے مجبور تھے اردو میں ریسرچ کا تو سوال ہی نہ تھا۔ البتہ اُدے پور یونیورسٹی اور راجستھان یونیورسٹی نے اساتذۂ اردو کے لیے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی خصوصی سہولت فراہم کی۔ چنانچہ راجستھان یونیورسٹی سے ڈاکٹر محمد علی زیدی اور راقم الحروف نے اور اُودے پور یونیورسٹی سے ڈاکٹر ثاقب رضوی نے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مذکورہ دونوں یونیورسٹیوں میں اردو ایم۔اے کی تعلیم کا آغاز ہونے پر باہر سے اساتذہ اردو یہاں آنے لگے چنانچہ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر فضل امام کا تقرر بحیثیت لکچرر شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی جے پور میں ہوا۔

ڈاکٹر فضل امام جے پور آنے کے بعد کچھ ہی عرصہ میں اپنے علم و فضل اور قابلیت و صلاحیت کے باعث مقامی ادبی ماحول میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان کو راجستھان کے ادیبوں اور شاعروں میں شمار کیا جانے لگا اسی نظریے کے تحت اگر یہ کہا جائے کہ راجستھان کے موجودہ ادیبوں میں ڈاکٹر فضل امام کا ایک انفرادی مقام ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

اس نظریے کو اس حقیقت سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ اگر چہ ڈاکٹر فضل امام نے جے پور آنے سے قبل گورکھپور یونیوسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تھی مگر موصوف کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی کارنامہ ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری'' جے پور میں تشریف آوری کے بعد ۱۹۷۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا اور اس کے بعد آپ کی تصنیفات اور تالیفات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ صرف آٹھ سال کے عرصہ میں موصوف کی حسب ذیل کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں:

(۱) بھوجپوری ادب کا تعارف مطبوعہ ۱۹۷۴ء

(۲) مثنوی خنجرِ عشق۔ تسلیم (ترتیب و مقدمہ) مطبوعہ ۱۹۷۴ء

(۳) امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری مطبوعہ ۱۹۷۴ء

(۴) جدید ہندی شاعری۔ سمت و رفتار مطبوعہ ۱۹۷۵ء

(۵) نغمۂ مسلسل یا گوہر انتخاب تسلیم (ترتیب و مقدمہ) مطبوعہ ۱۹۷۶ء

(۶) افکار و نظریات (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۷۷ء

(۷) دیوانِ درد کا نقش اوّل مطبوعہ ۱۹۷۹ء

مذکورہ اردو مطبوعات کے علاوہ ہندی میں بھی حسب ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں:

(۸) اُردو ساہتیہ ایک جھلک حصہ اول ۱۹۷۵ء

(۹) اُردو ساہتیہ ایک جھلک حصہ دوم ۱۹۷۷ء

اور حسب ذیل تصانیف زیرِ طبع ہیں:

(۱۰) انیس۔ شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔ لٹ)

(۱۱) دبیریت کیا ہے؟

(۱۲) تخلیقات (مجموعۂ کلام)

(۱۳) اُردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس (ہندی زبان میں)

ان تصنیفات اور تالیفات کے علاوہ ڈاکٹر فضل امام کا جے پور آنے کے بعد سب سے بڑا کارنامہ اُردو میں ڈی۔لٹ کرنا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ راجستھان میں اُردو میں ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کرنے کا اولین شرف ڈاکٹر فضل امام ہی کو حاصل ہے۔

پچھلے چھ ۶ سال کے عرصہ میں اس صوبے میں منعقد ہونے والی بیشتر ادبی تقریبات میں ڈاکٹر فضل امام بحیثیت شاعر، ادیب اور مقرر برابر شریک ہوتے رہے ہیں آپ کے تحقیقی و تنقیدی مقالات نے راجستھان میں ادبی معیار کو بلند کیا ہے۔ راجستھان سے قطع نظر ملک کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات، سمپوزیم، سیمنار، اور کانفرنسوں وغیرہ میں موصوف نے راجستھان کی نمائندگی کی ہے۔ ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں اُن کے مضامین، مقالات اور منظومات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان علمی و ادبی کارناموں کے باعث موصوف کو تمام ملک میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایسی ادبی شخصیت کو اپنا کر راجستھان ڈاکٹر فضل امام پر فخر کرتا ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اُن کے حالاتِ زندگی سے بھی مختصر طور پر متعارف کردیا جائے۔

سید فضل امام رضوی ۷/اگست ۱۹۴۰ء کو ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی) کی مردم خیز سرزمین کے قصبہ بہاء الدین پور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی اور پھر لکھنؤ میں رہے۔ آگرہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اُردو کے علاوہ ہندی میں ساہتیہ رتن کا امتحان بھی پاس کیا۔ شروع میں کچھ عرصہ ڈگری کالج بلرام پور میں شعبۂ اُردو میں لکچرر کی حیثیت سے تعلیمی خدمت انجام دی اور ۱۹۷۳ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور میں بحیثیت لکچرر شعبۂ اُردو آپ کا تقرر آپ ہوا اور اب اسی شعبہ کے آپ صدر ہیں۔ اسی کے ساتھ مذکورہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس اور بورڈ آف اسٹڈیز

اُردو، فارسی و عربی کے رُکن اور بورڈ سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان اجمیر کی اُردو کمیٹی کے کنو ینر بھی ہیں۔ مختلف علمی ادبی انجمنوں کو آپ کی رُکنیت کا شرف حاصل ہے۔

ڈاکٹر فضل امام کو اُن کے ادبی کارناموں پر ملک کے مختلف صوبوں کی اُردو اکیڈیمیز نے گرانقدر انعامات سے نوازا ہے۔ چنانچہ آپ کی تصنیف ''بھوجپوری ادب کا تعارف'' پر بہار اُردو اکیڈیمی نے اور ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری'' پر اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی نے آپ کو نقد انعامات عطا کیے ہیں۔

اسی طرح ملک کے مقتدر ادیبوں نے موصوف کی تخلیقات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اُن کی ادبی عظمت کے شاہد ہیں۔ اُن میں سے چند حضرات کے اقتباسات بطور ثبوت درج ذیل ہیں:

> (۱) ''آپ کی گرانقدر تصنیف ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری'' ملی۔ تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ بہت جم کر اور ڈٹ کر کام کر رہے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ بہت کام کرتے رہتے ہیں آپ کے مضامین میں ہندی اور راجستھانی سے متعلق کئی چیزیں ہیں۔ یہ آپ کی خصوصیت ہے۔'' (ڈاکٹر گیان چند جین)

پروفیسر: صدر شعبۂ اُردو مرکزی یونیورسٹی حیدرآباد ۱۵ر مارچ ۱۹۷۵ء

> (۲) ''ڈاکٹر فضل امام نے ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر کے بہت بڑی کمی پوری کی ہے۔ اُن کا اندازِ تحقیق وتنقید و دلنشین ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔''

مشفق خواجہ

ناظم آباد۔ کراچی پاکستان

(۳) ''میری نظر سے ڈاکٹر فضل امام کی اب تک کی بھی مطبوعہ کتابیں گزری ہیں جو اُن کی لگن، علمی ذوق وشوق اور اچھی صلاحیتوں کی نشاندہی کرتی ہیں لیکن یہ تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام تصانیف میں ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری'' کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو ادب میں اہم اضافہ ہے۔''

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

صدر شعبۂ اُردو۔ سیفیہ کالج۔ بھوپال (مدھیہ پردیش)

(۴) ''کتاب میں ایسے نشانات واضح ہیں جن سے ڈاکٹر فضل امام کی خوبیِ استعداد، خود اعتمادی اور جرأت اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۹۶ پر پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسے مقتدر اور مستند ناقد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے نظریہ کی تائید میں ڈاکٹر فضل امام نے جو دلائل و براہین پیش کیے ہیں اُن سے نہ صرف مطالعہ کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے نتائج فکر پر اعتماد ہے اور یہ اعتماد اور جرأت بہت اہم ہے۔''

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مئی ۱۹۷۱ء

(۵) ''ڈاکٹر فضل امام داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بھوجپوری زبان کی تاریخ لکھنے کی پہل کی اور اُردو والوں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ اُمید ہے کہ ان کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

ماہنامہ شاعر بمبئی۔ اگست ر ستمبر ۱۹۷۶ء

(٦) ''ڈاکٹر فضل امام نے بھوجپوری ادب کا تعارف'' کا مواد فراہم کرنے میں محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور کافی مطالعہ کیا ہے۔ زبان کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھی ہے اور موضوع کے لحاظ سے کتاب کی ترتیب کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بھوجپوری زبان کی معلومات کے ساتھ اُردو داں طبقہ میں لسانی ربط بھی پیدا ہوگا۔ یہ نقوش دوسرے اہل قلم کے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔''

ڈاکٹر سیفی پریمی

ماہنامہ کتاب نما۔ دہلی۔ جنوری ١٩٧٥ء

(٧) ''بھوجپوری'' (زبان) اُردو کے لیے بالکل اجنبی نہیں رہی لیکن اُردو اور اُردو کے مشترکہ تہذیبی مزاج سے قریب کے باوجود اُردو میں بھوجپوری زبان اور ادب کے بارے میں کوئی معلوماتی رسالہ یا کتاب دستیاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی مختصر تصنیف ''بھوجپوری اُدب کا تعارف'' کے ذریعہ اس کمی کو بڑی حد تک دور کیا ہے...... ڈاکٹر فضل امام نے جدید سائنٹفک انداز سے اس مختصر تعارف کو اس طرح تشکیل دیا ہے کہ بھوجپوری زبان و ادب کی ایک اجمالی تصویر ذہن نشین ہو جاتی ہے اُردو والوں اور اُردو کے طالب علموں کے لیے یہ ایک ایسا اہم کارنامہ ہے جسے دیکھ کر یہ آرزو ہوتی ہے کہ کاش اُردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے بارے میں بھی اس طرز کی تعارفی اور معلوماتی تصانیف میسر آسکتیں۔''

محمود ہاشمی

''ہماری زبان'' دہلی۔ نومبر ١٩٧٤ء

(۸) ''مشرقی اُتر پردیش میں اعظم گڈھ کو ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کی سرزمین بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی، علامہ شبلی نعمانی ندوی، عبدالسلام ندوی، اقبال سہیل، شاہ معین الدین ہندی، مولانا سید محمد رضا قبلہ، پروفیسر سید احتشام حسین، علی جواد زیدی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن وغیرہ جیسی مقتدر علمی و ادبی ہستیاں اسی سرزمین سے اُٹھیں اور بساط علم وادب پر چھا گئیں۔ انتہائی مسرت ہے کہ ڈاکٹر فضل امام بھی سرزمین اعظم گڈھ کی علمی وادبی روایات کے امین وترجمان ہیں۔ اُردو کے نوجوان محققین اور ناقدین میں انھوں نے اپنا نمایاں اور قابل رشک مقام بنا لیا ہے۔ ''افکار ونظریات'' ڈاکٹر فضل امام کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ان کا منطقی استدلال، علمی تفحص، تحقیقی ریاضت، تاریخی حقیقت اور تنقیدی وزن اور وقار شامل ہے وہ ادب پارے کو فن کی کسوٹی پر پرکھ کر دوٹوک رائے ظاہر کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے اور یہی ان کے قلم سے نکلی ہوئی نگارشات کی بنیادی خصوصیت ہے۔''

امیر احمد صدیقی

ایڈیٹر ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ۔ مارچ ۱۹۸۷ء

(۹) ''ڈاکٹر فضل امام صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کیونکہ اگر وہ مثنوی ''خنجر عشق'' شائع نہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ یہ مثنوی بھی دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتی اور ہم اپنے ایک قیمتی ادبی ورثے سے محروم ہو جاتے۔ ڈاکٹر فضل امام نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اسے مرتب کیا ہے۔''

ڈاکٹر خلیق انجم

ایڈیٹر ''ہماری زبان'' دہلی، یکم ستمبر ۱۹۷۴ء

(۱۰) ڈاکٹر فضل امام اُردو کے نوجوان محقق اور اُستاد ہیں..... ''مثنوی خنجر عشق'' تسلیم کی مثنوی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس مثنوی کو ایڈٹ کر کے معینہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے مگر بے جا طوالت سے پاک ہے مقدمہ میں مثنوی کی مختصر تاریخ اور خصوصیات کے علاوہ امیر اللہ تسلیم کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا تعارف کرا کے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کی کاوش لائق تحسین ہے۔ جن کی سعیٔ جمیل سے اُردو کی یہ غیر مطبوعہ مثنوی شائع ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر عنوان چشتی

ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں ڈاکٹر فضل امام کی مطبوعہ تصانیف و تالیفات کا جائزہ لینے پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کی گرانقدر تحقیقی و تنقیدی کاوشات اُن کی علمی بصیرت، فکری جودت، تحقیقی ریاضت، تنقیدی صلاحیت اور ستھرے ادبی ذوق کی شاہد اور روشن مستقبل کی ضامن ہیں۔

راجستھان میں اُردو تحقیق و تنقید کے باب میں ڈاکٹر فضل امام کی نگارشات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تخلیقات سے پہلے تشکیل راجستھان کے بعد اس صوبے میں تحقیق و تنقید کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا اور مولانا شاغل نے ''تذکرہ شعرائے جے پور'' لکھ کر ایک طرف راجستھان کی ادبی تاریخ سے روشناس کرایا تھا اور دوسری جانب محققین ادب کی جادہ پیمائی کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ تذکرہ شعرائے جے پور کے بعد بہارِ سخن (تذکرہ شعرائے جودھپور، مصنفہ شرف الدین یکتا)

راجستھان کے موجودہ اُردو شاعر، (بخط دیوناگری) مرتبہ پروفیسر پریم شنکر سریواستو، اور تذکرہ ''دامانِ باغباں'' مرتبہ سالک عزیزی اور عارف بیکانیری شائع ہوئے ان کے علاوہ راجستھان کی ادبی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مولانا منظورالحسن برکاتی (ٹونک مفتوںؔ کوٹوی (کوٹہ) وحید اللہ خاں (جودھ پور) قاضی معراج الدین (دلولپور، فضل المتین (اجمیر) کلیم الدین تجلی (جے پور) اور بہت سے دوست حضرات کے مضامین اور مقالات بھی مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ بعض مقالات ان سپوزیم، سیمناراور کانفرنسوں وغیرہ کے مرہونِ منت بھی ہیں جواس صوبے کے مختلف مقامات پر منعقد ہوئے یہ تمام ذخیرہ تحقیق سال کے عرصہ میں اُبھرنے لگا ہے۔ اوراُس کواساتذۂ اُردو تک ہی محدود سمجھا جاسکتا ہے۔ اُس کا تعین ڈاکٹر محمد علی زیدی کے تحقیقی مقالے ''مطالعۂ داغ'' اور راقم الحروف کے تحقیقی مقالے ''راجستھان میں اُردوادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات'' سے کیا جاسکتا ہے جن پر ۱۹۷۰ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں عطا کی تھیں۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر ثاقب رضوی کا احسان اللہ بیاںؔ سے متعلق تحقیقی مقالہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ راجستھان کی ادبی تاریخ سے متعلق مختار شمیم کی تصنیف ''ریاست ٹونک اوراُردو شاعری'' بھی شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی مگر یہ تصنیف راجستھان کے اہلِ قلم کی نگارشات میں شمار نہیں کی جاسکتی۔ ان تحقیقی مقالات کے علاوہ ڈاکٹر زیدی، راقم الحروف اور چند دوسرے اساتذۂ اُردو کے تحقیقی مضامین ومقالات بھی شائع ہوئے جو جدید تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ تنقید سے زیادہ تحقیقی اہمیت کے حامل ہیں۔ اِس جدید تنقیدی شعور کے ارتقا میں ڈاکٹر فضل امام کی تصانیف وتالیفات راجستھان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے پچھلے

۶۔۷ سال کے عرصہ میں تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ جو گرانقدر اضافہ کیا ہے وہ راجستھان کی ادبی تاریخ کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس میں تحقیقی اعتبار سے علمی وادبی حقائق کی تلاش وتفحص کے لیے ریاضت ومشقت بھی نظر آتی ہے اور تنقیدی نقطۂ نظر سے وزن و وقار بھی۔ ان کے تنقیدی نتائج میں جرأت مندی، بے باکی اور اعتماد کے ساتھ آزادیٔ فکر اور غیر جانبداری کے جوہر موجود ہیں۔ جو ان کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام نے راجستھان میں اپنے طالب علموں کے ذریعہ بھی تحقیق و تنقید کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔ جہاں راجستھان میں ایک طرف وہ خود اُردو کے پہلے ڈی۔ لٹ میں وہاں دوسری جانب ان کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی پہلی امیدوار محترمہ روشن آرا کاظمی (لکچرر شعبۂ اُردو) نے ان کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ''اُردو کی طویل نظمیں'' پیش کیا اور اس کو راجستھان یونیورسٹی نے اُردو میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے منظور کیا ہے۔ محترمہ روشن آرا کاظمی ڈاکٹر فضل امام کی شاگرد بھی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے کچھ اُمیدوار بھی موصوف کی نگرانی میں اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر فضل امام کے زیرِ نگرانی تحقیقی کام کرنے والے امیدواروں میں ایسے موضوع پر بھی کام کر رہے ہیں جس کا تعلق راجستھان کی ادبی تاریخ سے ہے چنانچہ مسٹر غوث شریف عارف کا موضوع ''راجستھان میں اُردو شعروادب کا ارتقاء'' اور مس فیروز کا موضوع ''ٹونک میں شعروادب کا ارتقاء'' ہے یہ تحقیقی کام یقیناً اس صوبے کے ادبا روشعراء کے ادبی کارناموں کو منظرِ عام پر لائیں گے اور یہاں کی ادبی اہمیت کو روشن کریں گے۔ راجستھان کی

ادبی تاریخ سے متعلق یہ بہت بڑا کام ہوگا۔

ڈاکٹر فضل امام کو اردو کی طرح ہندی پر بھی قدرت حاصل ہے انھوں نے اُردو ادب کی تاریخ ہندی زبان میں مرتب کر کے ہندی کے اہلِ علم کو اُردو زبان کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کا سامان فراہم کیا ہے۔ اس سے دونوں زبانوں کے تاریخی رشتہ کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔

اسی طرح بھوجپوری ادب کی تاریخ لکھ کر اہلِ اُردو کو اُس زبان سے واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اُن سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ راجستھانی کو بھی اپنا موضوع بنائیں گے اور یہ کام اُردو کے لیے انفرادی حیثیت کا حامل ہوگا۔

غرض ڈاکٹر فضل امام نے اپنے علمی و ادبی کارناموں کے ذریعہ بہت تھوڑے عرصہ میں ادبی دُنیا میں اپنا مقام بنایا ہے ان کی نگارشات کی یہ رفتار اور اُن کا معیار تابناک مستقبل کی دلیل ہیں۔ [1]

(ڈاکٹر) ابوالفیض عثمانی
سابق صدر شعبۂ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج۔ ٹونک

---

[1] ماخوذ از۔ ڈاکٹر فضل امام: ایک مطالعہ

نازیہ عرشی
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

پروفیسر فضل امام...... مختصر تعارف

ادبائے وقت کا جہاں ہونا مقام ہے
اس منزل بلند پہ تیرا مقام ہے
اہل قلم میں روز یہ ہوتا ہے تذکرہ
اردو ادب کا نام ہی فضل امام ہے
(خوشتر مکرانوی)

اردو ادب میں پروفیسر فضل امام کی ذات گرامی ہمہ گیراور ہمہ صفات تسلیم کی جاتی ہے۔ وہ بیک وقت ایک مشہور استاد، ادیب، محقق، نقاد، شاعر، اور سب سے بڑھ کر انسان دوست ہیں۔ انھوں نے اپنے علمی و ادبی کارناموں کے ذریعہ تدریس و ادب کی دنیا میں منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی نگارشات حال اور مستقبل کے ادیبوں وطلبا کے لئے ایک ایسا سمندر ہے جس میں ڈوب کر وہ علم وادب کے نایاب موتی تلاش کر سکتے ہیں۔

پروفیسر فضل امام کی زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے ان کی پیدائش ۷ر اگست ۱۹۴۰ء کو اعظم گڈھ کے موضع بہاء الدین پور میں ہوئی آپ ایک علمی و ادبی

خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے چچا اُردو کے شاعر تھے۔ جن کا تخلص اقبالؔ تھا اس کے علاوہ ان کے والدین بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھے۔ پروفیسر فضل امام کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم اعظم گڈھ اور جون پور میں مکمل ہوئی۔ تعلیم کے ابتدائی دور میں ہی وہ شعر و ادب کی سمت راغب ہوئے اور مشاعروں و ادبی نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگے، یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے مقالات و مضامین لکھنے کی ابتدا کی جو اس دور کے مشہور رسائل اور جرائد میں برابر شائع ہوتے رہے۔

پروفیسر فضل امام کی تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے اور گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے منشی کامل (فارسی)، عالم (عربی) اور ہندی میں ساہتیہ رتن کا امتحان بھی پاس کیا۔

ان کی تدریسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ایم۔ ایل۔ کے ڈگری کالج بلرام پور شعبۂ اُردو میں بحیثیت لکچرر ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور میں ان کا تقرر ہوا، جہاں وہ ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۸۶ء تک لکچرر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ پروفیسر فضل امام کو راجستھان میں اردو کے پہلے ڈی۔ لٹ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے اور اس کے علاوہ، وہ راجستھان یونیورسٹی کی فیکلٹی آج آرٹس اور بورڈ آف اسٹڈیز اردو، فارسی و عربی کے رکن اور بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن راجستھان اجمیر کی اردو کمیٹی کے کنوینر بھی رہے۔

راجستھان کے بعد وہ الہ آباد تشریف لائے۔ جہاں ۱۹۸۶ء سے ۲۰۰۱ء تک ریڈر، پروفیسر، صدر (شعبۂ اردو)، چیف پراکٹر، لائبریرین، ٹیچر یونین AUTA کے چیرمین، سر سندر لال ہاسٹل کے وارڈن کے طور پر اپنی بیش قیمتی خدمات انجام

دیتے رہے اس دوران وہ یو پی پبلک سروس کمیشن کے چیر مین بھی رہے۔ ان کے اندر مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا بلکہ ہے یہی وجہ تھی کہ اتنی مصروفیات کے باوجود ادب کی جانب ان کا رجحان کم نہ ہوا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا جو آج بھی قائم ہے۔ پروفیسر فضل امام کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد رقم طراز ہیں۔

> ''ڈاکٹر فضل امام کے علمی اور ادبی کارناموں پر رشک آتا ہے......
> میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر توجہ شعبے کی تعمیر و ترقی کو دی جائے تو اپنا لکھنے پڑھنے کا کام پس پشت چلا جاتا ہے اور اگر اپنا تخلیقی کام پیش نظر ہو تو شعبہ ترقی نہیں کر سکتا........ لیکن ڈاکٹر فضل امام نے اس ضمن میں ایک معجزہ دکھایا ہے اپنی توجہ شعبے کے کاموں اور اپنے تخلیقی کاموں میں اس طرح تقسیم کی ہے کہ دونوں میں سے کسی کا نقصان نہیں ہونے پایا۔''
>
> (ڈاکٹر فضل امام، ایک مطالعہ، خوشتر مکرانوی، ص۔ ۳۷)

پروفیسر فضل امام نے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں متعدد ادبی جلسوں، کانفرنسوں، سیمیناروں میں بھی شرکت کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے لندن، سنگاپور، پاکستان، ایران، شام، دوبئی، کشمیر کا سفر بھی کیا۔ وہ ایک مستند اہل قلم تسلیم کئے جاتے ہیں لہٰذا ان ادبی تقریبوں میں آپ کی شمولیت ہی کامیابی کی ضمانت خیال کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ ان کے علمی و ادبی پروگرام دوردرشن، بی۔بی۔سی، آل انڈیا ریڈیو، آکاش وانی پر مسلسل جاری ہوتے رہتے ہیں۔ جس سے اہل ادب اور دیگر

افرادکوان کے خیالات سے مستفید ہونے کا برابر موقع فراہم ہوتا رہتا ہے۔

پروفیسر فضل امام کے علمی اورادبی کارنامے اردوادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں انھوں نے تعلیم وتدریس کی دنیا سے وابستہ ہوکر تحقیق وتنقید کے خارزار میں قدم رکھا، ان کا تحقیقی وتنقیدی اثاثہ اہل ذوق ونظر کے لئے قابل قدر ہے۔

ان کا اول تحقیقی کارنامہ ''امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری ہے۔ یہ ان کی پی، ایچ، ڈی کا مقالہ ہے۔ جس میں انھوں نے امیر اللہ تسلیم کی حیات اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ مقالہ ان کے علمی ذوق وشوق اور تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ۱۹۷۴ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ جس پر انھیں ''اتر پردیش اردو اکاڈمی'' انعام سے نوازا گیا۔ کسی ادیب کا اس کی پہلی تصنیف پر انعام یافتہ ہونا، اس کی علمی وادبی صلاحیتوں کا ثبوت ہے ''امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں کہ:

> ''میری نظر سے ڈاکٹر فضل امام کی اب تک بھی مطبوعہ کتابیں گذری ہیں۔ جو ان کی لگن، علمی ذوق وشوق اور اچھی صلاحیتوں کی نشاندہی کرتی ہیں، لیکن یہ تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام تصانیف میں ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری، کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اردوادب میں اہم اضافہ ہے۔''

(ڈاکٹر فضل امام۔ ایک مطالعہ۔ ص ۶۰۔۵۹)

درحقیقت اس کتاب کے ذریعہ ہی پروفیسر فضل امام کے تحقیقی وتنقیدی سفر کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اس طویل اور کامیاب سفر میں ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں

جس نے ادبی حلقوں میں ان کے وسیع مطالعہ، قوت مشاہدہ اور منطقی طرز استدلال کا لوہا منوایا۔ پروفیسر فضل امام نے مبادیات تحقیق وتنقید کی پاسداری کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ وہ ادب میں قائم شدہ مسلمات پر غور ضرور کرتے ہیں لیکن اس کی اندھی تقلید کے قائل نہیں امام صاحب جس کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں یا کسی ادب پارے کو فن کی کسوئی پر پرکھتے ہیں تو اس کا گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کرتے ہیں پھر اس پر اپنی دو ٹوک رائے دیتے ہیں۔ وہ نظریات کی تردید بھی کرتے ہیں اور اضافہ بھی، دوسرے لفظوں میں امام صاحب ایک سمت بت شکنی کا عمل انجام دیتے ہیں تو دوسری طرف کعبہ سازی بھی کرتے ہیں۔ اصول پسندی، آزادیِ فکر، وضع داری، رواداری اور غیر جانبداری یہ وہ غالب عنصر ہیں جو ان کے فن کی بنیاد ہیں۔

امام صاحب کی ایک اہم خوبی ان کا اسلوب نگارش ہے خیالات کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں، اگر ان کو مناسب لب ولہجہ میں قلم بند نہیں کیا گیا، تو وہ اپنی اہمیت کھودیتے ہیں فضل امام اس راز سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی تحریریں بے جا عبارت آرائی، رنگین بیانی سے یکسر پاک ہیں، وہ دقیق سے دقیق مسائل کو بھی اس سادگی سے قلم بند کرتے ہیں کہ موضوع کا اصل مدعا مفقود نہیں ہونے پاتا، فکر کی گہرائی، موضوع پر مضبوط گرفت اور اظہار کی ندرت ہی ان کی نثر کو دلفریبی اور دلآویزی بخشتی ہے جس سے دوران مطالعہ قاری کی دلچسپی کسی مقام پر کم نہیں ہوتی اور وہ براہ راست ان کے خیالات سے، استفادہ کرتا ہے۔

پروفیسر فضل امام کی تصنیف وتالیف کی فہرست طویل ہے۔ جس میں ''مسدس روودادِ غم'' (ترتیب ومقدمہ) ۱۹۷۲ء ''مثنوی خنجر عشق تسلیم'' (ترتیب ومقدمہ) ۱۹۷۴ء، ''جدید ہندی شاعری: سمت ورفتار'' (تنقید) ۱۹۷۵ء، ''نغمۂ مسلسل یا گوہر

انتخاب تسلیم" (ترتیب و مقدمہ) ۱۹۷۲ء، "افکار ونظریات" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۷۷ء، "دیوان درد کا نقش اوّل" (تحقیق ، ترتیب و مقدمہ) ۱۹۷۹ء، "موازنۂ انیس ودبیر۔ شبلی نعمانی" (ترتیب ومقدمہ) ۱۹۸۱ء، "انیس شناسی" (مجموعۂ مضامین) ۱۹۸۱ء، "انیس شخصیت اورفن" (ڈی لٹ کا تحقیقی مقالہ) ۱۹۸۱ء، "شاعرآخرالزماں: جوش ملیح آبادی" (تنقید)، "مشرقی انتقادیات۔ اصول و نظریات" (تنقید) "انتخاب کلام حسرت موہانی"، "تذکرہ جلوۂ خضر۔ صغیر بلگرامی" (ترتیب ومقدمہ) "سیف و سبو: جوش ملیح آبادی' (ترتیب ومقدمہ) "اُردو شناسی" (قواعد و املا) "عثمان عارف۔ ایک مطالعہ" (تنقید)، "تنقیدی معیار"، (تنقیدی مضامین) "علامہ اقبال کی اساسِ فکر" (تنقید)، "امعانِ نظر" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۲۰۱۱ء جدید مرثیہ (ایک اجمالی جائزہ) ۲۰۱۳ء وغیرہ اہم ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان مختلف شہروں، صوبوں اور علاقوں میں تقسیم ہے ظاہر ہے ہر علاقے کی زبان، تہذیب اور طرز معاشرت جداگانہ ہے، چونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے لہٰذا کسی زبان کے ادب کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے ادیب کو مذکورہ نقطوں سے واقفیت لازمی ہے۔ اس تعلق سے جب ہماری نظر پروفیسر فضل امام کی سمت اٹھتی ہے تو ان کے قوت مشاہدہ اور وسعت نظری کا قائل ہونا پڑتا ہے، اُنھوں نے اردو ادب کے علاوہ بھوجپوری، راجستھانی اور ہندی ادب میں بھی اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اردو ادب میں عام طور پر دیگر زبانوں کے ادب کی تخلیق پر توجہ نہیں دی گئی ہے یہ پروفیسر فضل امام کا ہی کمال ہے کہ انھوں نے "بھوجپوری ادب کا تعارف" اور "راجستھانی زبان وادب کا تعارف" اردو زبان میں رقم کر کے اہل اردو کو دیگر علاقوں کی زبان وادب سے متعارف کرانے کا فریضہ انجام

دیا اور اہل قلم کو اس سمت غور و فکر کی دعوت دی۔ پروفیسر فضل امام کے فن کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے محمود ہاشمی رقم طراز ہیں :۔

> ''بھوجپوری'' (زبان) اردو کے لئے بالکل اجنبی نہیں رہی۔ لیکن اردو اور اردو کے مشترکہ تہذیبی مزاج سے قرب کے باوجود اردو میں بھوجپوری زبان اور ادب کے بارے میں کوئی معلوماتی رسالہ یا کتاب دستیاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی مختصر تصنیف ''بھوجپوری ادب کا تعارف'' کے ذریعہ اس کمی کو بڑی حد تک دور کیا ہے..... ڈاکٹر فضل امام نے جدید سائنٹفک انداز سے اس مختصر تعارف کو اس طرح تشکیل دیا ہے کہ بھوجپوری زبان و ادب کی ایک اجمالی تصویر ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اردو والوں اور اردو کے طالب علموں کے لیے یہ ایک ایسا اہم کارنامہ ہے جسے دیکھ کر یہ آرزو ہوتی ہے کہ کاش اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے بارے میں بھی اس طرز کی تعارفی اور معلوماتی تصانیف میسر آسکیں۔''
>
> (ڈاکٹر فضل امام۔ ایک مطالعہ۔ خوشتر مکرانوی۔ ص۔۶۲)

پروفیسر فضل امام نے جہاں ایک طرف بھوجپوری اور راجستھانی ادب کو اردو میں منتقل کیا وہیں دوسری سمت اردو ادب کی تاریخ کو بعنوان ''اردو ساہتیہ ایک جھلک'' ح (صہ اول ۱۹۷۵ء)۔ حصہ دوم ۱۹۷۶ء ہندی کے قالب میں ڈھالا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''کلامِ جوش'' اور پاکستان کا پرتدوندھی ساہتیہ تخلیق کر کے اہل ہندی کو اردو زبان و ادب سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور دونوں زبانوں کے تاریخی رشتہ کو استحکام بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔

پروفیسر فضل امام ایک کامیاب، معلم، محقق اور نقاد ہی نہیں شاعر بھی ہیں۔

انھوں نے تحقیق وتنقید کے خارزار کے ساتھ شاعری کی حسین ودلکش وادیوں کی سیر بھی کی ہے۔ شاعری کی سمت ان کا رجحان ابتداء سے ہی تھا۔ لیکن نثر کے میدان میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس کی جانب باضابطہ توجہ نہ دے سکے۔ ان کا اب تک کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ ان کی شعری نگارشات کو خوشتر مکرانوی نے اپنی کتاب ''ڈاکٹر فضل امام، ایک مطالعہ'' میں یکجا کیا ہے۔ جس میں ان کے قطعات اور غزلیات شامل ہیں جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کے نغمے بھی گائے ہیں اور غم دوراں کا شکوہ بھی کیا ہے، ان کی شاعری دلوں کے تاروں کو چھیڑتی بھی ہے اور ذہنوں کو جھنجھوڑتی بھی ہے۔ پروفیسر فضل امام کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نریش نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں، وہ ان کی مکمل شاعری کا احاطہ کرتے ہیں ڈاکٹر نریش لکھتے ہیں کہ:۔

> ''ڈاکٹر فضل امام کے یہاں آپ کو دل بھی ملے گا، نگاہ بھی اور ذہن بھی۔ دل، جو حسن کا شیدائی ہے، جنون عشق کی انتہا دیکھنا چاہتا ہے، معشوق کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں رہنا چاہتا ہے.....اس کے ستم کا شکوہ کرتا ہے اور اس کی بے اعتنائی پر آہ بھی بھرتا ہے۔ نظر، جو مناظر قدرت کا حسن بھی دیکھتی ہے اور چاند کے داغ کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ جو حسن جاناں سے لپٹ لپٹ جاتی ہے مگر اپنے ماحول سے بے خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور ذہن، جو امراض معاشرہ کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور ان کا علاج بھی تلاش کرتا ہے، جو اپنے دور کی غیر مساوی تقسیم زر سے پیدا ہوئی مشکلوں اور مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور جہد مسلسل کی شمع لے کر زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی بھی بکھیرتا ہے۔''

(ڈاکٹر فضل امام۔ خوشتر مکرانوی۔ ایک مطالعہ۔ ص ۹۰۔۸۹)

ڈاکٹر نریش کے مذکورہ بیانات پروفیسر فضل امام کی شاعری کے مقاصد اور اسرار ورموز کو بخوبی عیاں کر دیتے ہیں ان کی شاعری کے حوالے سے اگر یہاں، کچھ شعر نقل کر دیئے جائیں تو بے جا نہ ہوگا ۔

جانے والے کو کہیں روک سکا ہے کوئی
پھول برساؤ گے کیا آگ لگا کر جاؤ
مجھ سے مانگے نہ کہیں میری تمنا تجھ کو
اپنے دامن سے چراغوں کو بجھا کر جاؤ

(قطعہ)

کھلیں ہیں پھول چمن میں شگفتگی تو نہیں
اب اس نظام میں کچھ رسم دلبری تو نہیں
جلاؤ شوق سے راون کو رام کے بھکتو
وہ جل کے روشنی دیتا ہے، تیرگی تو نہیں
مرا سوال یہ ہے عہد نو کے راون سے
ترا وجود بہ عنوانِ آدمی تو نہیں
سسکتی روحوں کے جھلسے ہوئے ہیں مستقبل
وجود پیکر آدم ہے، زندگی تو نہیں

پروفیسر فضل امام کو ان کی گراں قدر ادبی خدمات پر مختلف انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا، جن میں "امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری"، "افکار و نظریات" "دیوان درد کا نقش اوّل"، "انیس شخصیت اور فن"، "ارمغانِ نظر" پر "اتر پردیش اکادمی" اور "بھوجپوری ادب کا تعارف" پر "بہار اردو اکادمی انعامات ملے، اس کے

علاوہ انھیں اکھل بھارتی بھوجپوری پریشد سے ''بھوجپوری بھاسکر''، ''ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ سے ''ودیا واچسپتی'' (ڈی ۔لٹ ۔ کے برابر)، اکھل بھارتی بھاشا سنگھان، بھوپال سے ''ساہتیہ بھوشن''، آل انڈیا میر اکادمی۔ لکھنؤ سے ''نوائے میر'' اعزازات سے بھی آراستہ کیا گیا۔

پروفیسر فضل امام ایک متوازن نقاد، مستند ادیب، خوش فکر شاعر ہی نہیں بے حد اچھے انسان بھی ہیں، خوش اخلاقی، فیاضی، رحم دلی، حق گوئی و بے باکی ان کی شخصیت کے اہم عنصر ہیں، وہ ہمیشہ خوش وخرم رہتے ہیں ۔ نامساعد حالات کی تاریکیوں میں بھی تبسم کی روشن کرن ان کے لبوں سے جدا نہیں ہوتی۔ وہ ہر کسی سے نہایت اپنائیت، خلوص ومحبت سے ملتے ہیں۔ ان کی یہی خوبی انھیں ہر دل عزیز بناتی ہے۔ وہ محفلوں کی جان تو ہوتے ہیں، بحیثیت استاد بھی خاص مقبولیت رکھتے ہیں، ان کی نگرانی میں اب تک ۲۷۔۲۸ طالب علموں نے پی، ایچ، ڈی اور ڈی ۔لٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ یہ خیال عام ہے کہ نگراں طلبہ کی تحقیقی زندگی کو دشوار بناتے ہیں، انھیں مختلف طریقوں سے ذہنی اذیت دیتے ہیں۔ لیکن بحیثیت شاگرد میں پروفیسر فضل امام کی شخصیت کے حوالے سے اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ وہ بے حد شفیق ورفیق ہیں۔ پروفیسر فضل امام شاگردوں کے مصائب کو بخوبی سمجھتے ہیں اور تحقیقی کاموں میں قدم قدم پر شاگردوں کی رہنمائی کرتے ہیں پروفیسر فضل امام شاگردوں کو محض کتابی سبق ہی نہیں دیتے بلکہ جدوجہد، ہمت وحوصلہ کا وہ درس دیتے ہیں جس کی ضرورت زندگی میں قدم قدم پر درپیش ہوتی ہے بحیثیت استادان کی محبتوں اور شفقتوں کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل ہے۔

پروفیسر فضل امام کو مذہبی روایتوں سے بھی دلچسپی ہے، عام طور پر یہ دیکھا

جاتا ہے کہ انسان دنیاوی مشغلوں میں اُلجھ کر دین کو فراموش کر دیتا ہے لیکن پروفیسر فضل امام دین و دنیا کو ساتھ لئے چلتے ہیں۔ وہ محرم و میلاد کی مجلسوں میں جاتے ہیں۔ مرثیہ خوانی بھی کرتے اور اپنی پر زور تقریر کے سحر سے لوگوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔ پروفیسر فضل امام کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے، محمد ہارون لکھتے ہیں کہ:

> ''شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر تو آپ علم و ادب کے دریا بہاتے ہی ہیں لیکن سیرت پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور شہید کربلا حضرت امام حسینؑ کے مقصد شہادت پر بھی آپ جب جنبش لب سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک دریا ہے جسے اذن روانی مل گئی ہے۔ جس سے آپ کی تاریخ اسلام اور دیگر ادیان کی تاریخ کے اتھاہ اور تقابلی مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان بھر میں اپنی تقریر کی سحر کاری کے باعث مقبول ہیں''
>
> (ڈاکٹر فضل امام۔ ایک مطالعہ ص ۶۰۔۵۹)

پروفیسر فضل امام کے یہاں مذہب کی تفریق نہیں۔ وہ ہر مذہب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کی شخصیت پر اقبال کا یہ مصرعہ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' ٹھیک بیٹھتا ہے گویا یہ مصرعہ خود ان کی ذات کے لئے ہی بنا ہو۔ ان کے یہاں شیعہ اور سنی کا بھی اختلاف نہیں ان کی شخصیت کی تعمیر میں خود سنی حضرات کا ہاتھ زیادہ ہے۔ پروفیسر فضل امام کی سنیوں (خواہ ان کے عزیز ہوں یا شاگرد) پر ہمہ وقت عنایت خاص رہتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں کثیر تعداد سنیوں کی ہی ہے۔ وہ مذہب و مسلک سے پرے انسان سے محبت کرتے ہیں اور اس کی فلاح و بہبود کے خواہش مند ہیں۔ فضل امام صاحب کا بیان ہے کہ اُن کے حنفی المذہب اعزا کی عنایات بے پایاں میرے

ہمیشہ شامل حال رہیں۔ میری شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کا اہم رول ہے۔"

تیرے نفس نے قلب کے غنچے کھلا دئے
تیرے عمل نے کتنی تھکانیں اُتار دیں
وہ آئنہ ہے تیری امامت کے ہاتھ میں
جس نے نقوش عزم کی شکلیں سنوار دیں

پروفیسر فضل امام تاعمر اونچے عہدے پر فائز رہے یہ عہدے جو ان کے اختیارات کو وسیع کرتے تھے لیکن کبھی انھوں نے ان کا غلط استعمال نہ کیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مستحق کو اس کا واجب حق ملے۔ وہ حق پرست بھی ہیں اور کشادہ قلب بھی۔ ان کا کشادہ دل محبت سے لبریز ہے۔ جس میں دستک محبت کے ذریعہ کوئی بھی داخل ہو سکتا ہے۔

پروفیسر فضل امام کے کارناموں کا عمیق مطالعہ ہمیں یہ کہنے کا حق دیتا ہے کہ انھوں نے تاعمر ادب کی خدمت کی، ان کا ہر قدم زبان و ادب کی ترقی و فروغ کے لئے اٹھا۔ انھوں نے اردو، بھوجپوری، راجستھانی اور ہندی ادب میں جو خدمات انجام دیں اس نے ادبی دنیا میں انھیں بلند مقام عطا کیا ہے۔ ان کی نگارشات حال اور مستقبل کے ادیبوں کے لئے مشعل راہ ہیں جو انھیں کامیابی کی منزل کی سمت گامزن کریں گی۔

نازش خلیل
ریسرچ اسکالر فیض آباد

پروفیسر فضل امام حیات اور شخصیت کے چند پہلو

(خاندانی پس منظر)

پروفیسر فضل امام کے آباواجداد کے بارے میں آئینۂ اودھ شاہ ابوالحسن میں ملتا ہے کہ عہد تغلق میں ہرات سے آئے تھے اور ان کے مورثِ اعلیٰ سید جمال الدین قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے (۱۷) سترہ مواضعات ملے تھے اور وہ ضلع اعظم گڑھ کے موضع سید پور بسیکھا میں آباد تھے سید پور میں وہ جگہ آج بھی حویلی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ان کے نگڑ دادا مولوی سید فضل امام جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ انگریزوں سے بہت نفرت کرتے تھے ایک بار ایک انگریز حاکم نے ان سے جب ملاقات کرنی چاہی تو پہلے انکار کر دیا اور جب اصرار بڑھا تو پالکی سے ملنے پہنچے انگریز حاکم نے جب ہاتھ ملانا چاہا تو ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا کیونکہ ہاتھ ملانے سے ان کا ہاتھ ناپاک ہو جاتا اس بات سے ناراض ہو کر انگریز حاکم نے تمام املاک و جائداد ضبط کر لی اور پھر دربدری کی زندگی شروع ہوئی وہاں سے کچھ لوگ مختلف مقامات پر روانہ ہو گئے۔

پروفیسر فضل امام کے پردادا سید ذاکر علی ایک اچھے وکیل تھے جن کے بیٹے سید علی حسن عرف غلام حسین تھے وہ بہت ورزش کرتے تھے اور پہلوان تھے اور ان کے

دو بیٹے تھے سید اقبال حسین اور سید مشتاق حسین اور ایک بیٹی تھی جن کا انتقال عالم شباب میں ہو گیا تھا۔ سید اقبال حسین کے بیٹے سید احمد حسن مچھلی گاؤں ضلع فیض آباد میں رہے اور ان کے دوسرے بیٹے سید مشتاق حسین جو کہ پروفیسر فضل امام کے والد تھے جو بہت ہی خوددار اور محنتی تھے انھوں نے کم عمری میں ہی رنگون، ملایا اور برما وغیرہ کا سفر کیا، رنگون میں ان کے ربر کے باغات تھے اور وہاں سب سے بڑے آکس مرچنٹ تھے۔ جب رنگون میں بم باری شروع ہوئی تو رنگون کو خیر باد کہا اور پھر موضع بہاء الدین پور کندھیا ضلع اعظم گڑھ آ گئے۔

پروفیسر فضل امام کے والد صاحب محکمۂ ریلوے میں ملازم ہو گئے اور زیادہ تر ان کا قیام جھانسی میں رہا۔ پروفیسر فضل امام کی والدہ محترمہ مرحومہ بتاتی تھیں کہ آپ کی ولادت ۱۹۴۲ء میں ہوئی اور برسات کا موسم تھا سخت بارش ہو رہی تھی اس لئے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اگست کا مہینہ رہا ہوگا۔ ہائی اسکول کی سند کے حساب سے پروفیسر فضل امام صاحب اتر پردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڈھ کے موضع بہاء الدین پور میں مورخہ ۷/ اگست ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔

پروفیسر فضل امام کا خاندان علم و ادب سے بہرہ ور تھا ان کے والد صاحب جناب سید مشتاق حسین رضوی اردو اور فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے ان کی والدہ بھی اردو فارسی کی معقول تعلیم حاصل کیے ہوئے تھیں۔ آپ کے چچا جناب مولوی سید اقبال حسین رضوی عالم و ادیب تھے اردو فارسی اور عربی کی اچھی استعداد رکھتے تھے پروفیسر فضل امام کی تعلیم و تربیت میں ان کے والدین کا زیادہ حصہ رہا ہے۔ جدید تعلیم کے لئے عربی فارسی کے ساتھ انگریزی تعلیم کے طرف متوجہ ہوئے ہائی اسکول انٹر، بی۔ اے، ایم۔ اے، (اردو) کی سند اوّل درجہ سے حاصل کی اس کے علاوہ منشی، کامل

(فارسی) اور عالم (عربی) کی سند عربی مدارس سے پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ پی، ایچ۔ڈی، اور ڈی۔لٹ کی ڈگری گورکھپور یونیورسٹی سے مایۂ ناز محقق و نقاد پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر حاصل کی۔آپ پورے راجستھان میں اردو کے پہلے ڈی۔لٹ ہیں۔اردو کے علاوہ پروفیسر فضل امام نے ہندی میں ساہتیہ رتن کا بھی امتحان پاس کیا۔وڈیا واچسپتی یعنی (ڈی۔لٹ ہندی) کی اعزازی سند ہندی ساہتیہ سمیلن نے تضویفں کی۔

پروفیسر فضل امام کی شادی محترمہ شمیم فاطمہ صاحبہ سے جون ۱۹۶۸ء میں ہوئی اور آپ کی ازدواجی زندگی کی شروعات ہوئی۔آپ کے تین بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں ہیں آپ نے اور آپ کی بیگم نے بچوں کو عمدہ تعلیم دی آپ کا بڑا بیٹا ڈاکٹر سید ذاکر امام عرف دانش انٹر کالج میں پرنسپل کے عہدے پر ہے دوسرا بیٹا جناب سید باقر امام عرف تابش جو ایم۔بی۔اے (M.B.A.) کیے ہیں۔ایک پرائیوٹ کمپنی میں سیلس منیجر ہے تیسرا اور چھوٹا بیٹا قارب امام عرف عابد ہے جو ذہنی طور پر معذور ہے آپ کی چاروں بیٹیاں ماشاء اللہ ازدواجی زندگی میں خوش حال ہیں۔آپ کی بڑی بیٹی ڈاکٹر خورشید فاطمہ گورنمنٹ انٹر کالج جے پور میں لکچرر ہیں اور ان کے شوہر ڈاکٹر علی حسن انگریزی شعبہ میں ڈگری کالج میں ریڈر ہیں آپ کی دوسری بیٹی شبیہ فاطمہ ایم۔ایس۔سی ہیں ان کے شوہر محمد اصغر .M.A کویت ایرلائنس میں ملازم ہیں۔تیسری بیٹی صبیح فاطمہ ایم۔اے۔بی ایڈ ہیں اور ان کے شوہر الہ آباد ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ ہیں۔ آپ کی چوتھی بیٹی سبیکہ فاطمہ ایم۔کام، بی ایڈ ہیں اور ان کے شوہر سید یوسف حسین ہیں جو کہ نیشنل بینک ابودھبی میں آپریشن منیجر ہیں۔

پروفیسر فضل امام پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مہارانی لکشمی

کنور ڈگری کالج بلرام پور میں لکچرر کی حیثیت سے تقریباً دو سال رہے فیض آباد میں بھی چار سال درس و تدریس میں شامل رہے۔ ۷ نومبر ۱۹۷۳ء کو راجستھان یونیورسٹی جے پور میں بحیثیت لکچرر جوائن کیا اور اپریل ۱۹۸۶ء تک وہاں لکچرر رہے اور صدر شعبہ بھی رہے۔ اس درمیان آپ دوبار صدر شعبۂ اردو و فارسی رہے اور اسی کے ساتھ مذکورہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس اور بورڈ آف اسٹڈیز اردو، فارسی و عربی کے رکن اور بورڈ سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان اجمیر کی اردو کمیٹی کے کنوینر بھی رہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے جوائن کیا الہ آباد میں ہی اتر پردیش سیکنڈری ایجوکیشن سروس کمیشن کے چیرمین کے عہدے پر فائز رہے مختلف علمی و ادبی انجمنوں کو آپ کی رُکنیت کا شرف حاصل ہے۔

پروفیسر فضل امام کو ان کے ادبی کارناموں پر مختلف صوبوں کی اردو اکیڈمیز نے گرانقدر انعامات سے نوازا ہے چنانچہ آپ کی تصنیف ''بھوجپوری ادب کا تعارف'' جو مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے، بہار اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ ہے ۱۹۷۴ء میں ''امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری'' پر اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ نے آپ کو نقد انعامات عطا کیا۔

اکھل بھارتی ''بھوجپوری بھاسکر'' کے اعزاز سے نوازا۔

اکھل بھارتی بھاشا سنگم نے ''ساہتیہ وبھوشن'' سے نوازا۔

بزمِ میکش آگرہ نے ''بزم میکش'' اوارڈ سے نوازا۔

۲۰۰۸ اپریل میں ''میکش اوارڈ'' بیادگار حضرت علامہ میکش اکبر آبادی میں جناب طیب علی کاظمی نے ''قطعۂ تاریخ تہنیت پیش کیا۔

پروفیسر فضل امام کا اسلوب بیان اور انداز تحریر ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا

ہے۔ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں متعدد، تاریخی، عمرانی، سیاسی، اور ادبی فکری دھارے کارفرما ہیں۔آپ نے اپنے عہد کے ان سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات سے اثر ضرور قبول کیا لیکن ان سماجی وسیاسی گرمیوں میں حصہ عملی طور پر نہیں لیا لیکن ملک کے فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ دل وجان سے کوشاں رہے جہاں تک شخصیت کی تعمیر وتشکیل کا سوال ہے تو آپ کی شخصیت کی تعمیر میں آپ کے والدین کا اہم رول رہا ہے۔

پروفیسر فضل امام ہمیشہ گاندھیائی نقطۂ نظر پر عمل پیرا رہے جیسا کہ گاندھی نے فلسفۂ حیات دیا تھا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے حادثے کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی میں ٹیچر ایسوسی ایشن کا جو الیکشن ہوا اس کے صدر کے عہدے پر آپ کامیاب ہوئے مخالف اور فرقہ پرست جماعتوں کے امیدواروں کو آپ نے شکست دی۔لوگوں سے بھی خلوص اور محبت سے ملتے رہے عید بقرعید میں لوگوں کا آنا جانا تھا۔ہولی دیوالی میں سب سے ملنے جاتے۔ڈاکٹر فضل امام کے عہد کا جو سیاسی، ادبی اور سماجی پس منظر ہے وہ بڑا علمی ہے۔آپ کے والد شعروادب سے شغف رکھتے تھے والدہ مرحومہ کو بھی شعروادب میں دلچسپی تھی سیاسی پس منظر میں کانگریس کی حکمرانی تھی آپ کے والد خود آزادی کی لڑائی میں جیل گئے۔آپ کے خاندان میں کوئی تعصب نہیں۔کوئی تعصب نہ آپ کے خاندان میں تھا نہ آپ کے بچوں میں ہے۔

کسی بھی انسان کی شخصیت میں جسمانی ساخت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ جس انسان کا حلیہ جتنا پُرکشش اور دلکش ہوگا وہ اتنا ہی دوسرے لوگوں کو متاثر کرے گا۔پروفیسر فضل امام ایک پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔آپ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے ہیں آپ کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ پھیلی رہتی ہے پریشانیوں اور دشواریوں میں بھی تبسم ریز رہتے ہیں۔بلند قد وقامت، گداز جسم، بلند سر، رنگ صاف، چوڑی

پیشانی، آپ کے حلیہ سے ایک دانشور اور مفکر کی شبیہ ابھرتی ہے۔ اور ایک طرح کا رعب اور وقار ظاہر ہوتا ہے۔

لباس کا انسان کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے لباس کے رنگ اور اس کی وضع قطع سے بھی انسان کی شخصیت کے اثرات دوسروں پر مرتب ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا نفیس لباس زیب تن کرتا ہے اس کی شخصیت کے اثرات دوسروں پر مرتسم ہوں گے پروفیسر فضل امام چیخ (گہرے) رنگ سے گریز کرتے ہیں سو بر لباس زیب تن کرتے ہیں گھر میں آپ عموماً کرتا پاجامہ ہی پہنتے ہیں سردیوں میں سوٹ پہنتے ہیں۔

آپ لوگوں سے انتہائی جوش اور انکسار سے ملتے ہیں لیکن جب کوئی آپ کے شعور کو ٹھیس پہنچاتا ہے تو وہاں وہ غرور کو عبادت کے درجہ میں داخل کر دیتے ہیں اور اپنے علمی و ادبی وقار کو مجروح نہیں ہونے دیتے لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ وہ عالم خفگی میں بھی چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہ پاتے۔ اکثر وہ جس سے خفا ہو جاتے اسے خود ہی رام کر لیتے ہیں حق گوئی اور بے باکی کے باعث وہ اہل خلوص میں کافی عزیز ہیں یہ ان کی شخصیت کی بنیادی صفت ہے۔

ڈاکٹر فضل امام نہایت ہمدرد اور رحم دل انسان ہیں آپ جب بھی کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتے ہیں تو صرف رسمی مزاج پُرسی سے ہی مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس کے علاج اور معالجے میں پیش آنے والی دشواریوں کو بھی دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اور کچھ اس طرح مریض کی مالی امداد (اگر مستحق امداد ہوا) فرما دیتے ہیں کہ مریض اور اس کے اعزا کو شرمندہ نہیں ہونا پڑتا احباب اور مستحق طالب علموں کی اعانت کرنا وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

پروفیسر فضل امام نے بین الاقوامی اور قومی سطح کے سیکڑوں سیمنار میں شرکت

کی دنیا کے بہت سے ملکوں میں گئے لیکن کھانے کے معاملے میں قناعت پسند ہیں۔ ملک گیر اور عالم گیر سطح کے سیمناروں اور اجلاسوں کے اہم رکن رہے ہیں وہاں قسم قسم کے کھانے کا انتظام رہتا ہے پر پروفیسر فضل امام ایسی جگہوں پر بھی قسم کے کھانے شوق سے تناول فرماتے ہیں۔

کھانے کے متعلق آپ کی اہلیہ محترمہ شمیم فاطمہ بتاتی ہیں پسندیدہ اشیائے خوردونوش کے بارے میں یہ کہ بچپن میں شیرینی بہت پسند تھی میرے ساتھ زندگی گزارنے کے ذیل میں وہ میٹھے پکوان اور بیسنی پکوان بہت دلچسپی سے استعمال کرتے تھے اور ان کے اس خوردونوش میں بچے بھی بہت شوق سے شریک ہوتے تھے لیکن علالت اور خاص طور سے شوگر کے مریض ہونے کے بعد احتیاط اور پرہیز لازم ہوگیا نتیجے کے طور پر لذت طعام میں شکر اور نمک دو چیز جو اہم ہیں ان کو چھوڑنا پڑا۔ اس لئے اب بغیر نمک کا سالن، اور دال سبزی جو کی روٹی اور کریلے پر گزر بسر ہو رہی ہے۔

کسی بھی انسان کے اطوار و عادات سے اس انسان کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر فضل امام کو بے اُصولی اور لا اُبالی پن سخت ناپسند ہے پڑھنا لکھنا اور زبان وادب کے دامن کو وسیع کرنا ان کا اہم مشغلہ ہے۔ وہ اپنے شب و روز کا زیادہ تر حصہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے ہیں۔ دوران ملازمت ناشتے سے فارغ ہوکر یونیورسٹی جاتے تھے اور وہاں سے واپسی کے بعد کھا پی کر آرام فرماتے تھے اور اگر کام زیادہ ہوتا تو دوپہر کا آرام ترک کر دیتے تھے۔ آپ کی مختلف اداروں سے وابستگی رہی ادبی سرگرمیوں اور دفاتری پیچیدگی کے بعد جو وقت ملتا اس میں زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے شام کے اوقات گھر والوں سے باتیں کرتے لوگوں سے ملتے جلتے پروفیسر فضل امام کی شخصیت کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ وقت کے پابندی انھیں بہت عزیز ہے

وقت کو بہت ہی سلیقے سے گزارتے ہیں پروفیسر فضل امام کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ حد درجہ جذباتیت سے گریز کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے مخالفین کے مخالفتوں کا جواب نہایت صبر و تحمل سے دیا کرتے ہیں۔ آپ کی نگرانی میں قریب (۳۵) پینتیس سے زیادہ امیدواروں نے پی، ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ فل کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ آپ کسی پر بھی عنوان یا موضوع نہیں تھوپتے بلکہ ان کو یہ آزادی رہتی ہے کہ وہ اپنے پسند کا موضوع منتخب کریں۔ اس کے ساتھ نگہبانی اور نگرانی بھی کرتے ہیں ہر ریسرچ اسکالر کو انداز فکر اور نقطۂ نظر کی آزادی دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

> ''ظاہر ہے ہر آدمی کی فکر و نظر اپنی ہے میری نگرانی میں جتنے مقالے لکھے گئے ہیں اس میں خود اسکالر نے اپنے ماخذات پیش کئے ہیں کیونکہ ہر آدمی کا اپنا فکر و نظریہ ہوتا ہے میں اپنا اندازِ فکر تھوپنے کی کوشش نہیں کرتا اور یہ ہونا بھی نہیں چاہئے''

پروفیسر فضل امام کا محبوب ترین مشغلہ پڑھنا لکھنا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے نئی سے نئی اور پرانی سے پرانی کتابیں ان کے پاس موجود رہتی ہیں اردو زبان کے علاوہ انگریزی بھوجپوری، فارسی ،وغیرہ کی کتابیں بھی ان کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اردو ہندی انگریزی کے رسالے بھی آپ نہایت انہماک سے پڑھتے ہیں وہ اردو زبان و ادب اور عالمی ادب میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں پر باریک نظر رکھتے ہیں آپ کے گھر کی لائبریری میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔

''ڈاکٹر فضل امام ایک مطالعہ'' صفحہ ۷ا پر خوشتر مکرانوی لکھتے ہیں:۔

> ''کسی ادیب کا قول ہے کہ.........'' کچھ انسان پیدائشی عظیم ہوتے ہیں کچھ محنت اور لگن سے عظیم انسان بن جاتے ہیں اور

کچھ پر عظمت تھوپ دی جاتی ہے۔"......ڈاکٹر فضل امام محنت
ریاضت اور جاں سوزی سے صاحب عظمت ہوئے وہ ہمہ وقت
مطالعہ میں غرق رہتے ہیں اور بہ یک وقت کئی زبانوں پر قدرت
رکھتے ہیں اور جہاں وہ تحریر کے دھنی ہیں وہیں تقریر کے عنوانِ جلی
ہیں۔ شعروادب کے دریا بہاتے ہیں لیکن سیرت پاک حضرت محمد
مصطفےٰ ﷺ اور شہید کربلا حضرت امام حسینؑ کے مقصد شہادت پر
بھی آپ جب جنبش لب سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علم کا
ایک دریا ہے جسے اذن روانی مل گیا ہے۔جس سے آپ کی تاریخِ اسلام
اور دیگر ادیان کی تاریخ کا اتھاہ اور تقابلی مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ
ہندوستان بھر میں اپنی تقریر کی سحر کاری کے باعث مقبول ہیں خشک
سے خشک موضوع کو بھی اپنے دلکش انداز سے تقریر سے دلچسپ بنا
دیتے ہیں اور مجمع وجد کرنے لگتا ہے۔"

پروفیسر فضل امام اردو زبان کی متحرک اور فعال شخصیت ہیں انھوں نے اردو زبان کے سفیر کی حیثیت سے اردو زبان وادب کو متعدد ملکوں اور زبانوں میں متعارف کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ لائق توجہ ہے۔ آپ نے بہت سے قومی اور بین الاقوامی سطح کے مذکرات سیمنار میں شرکت کی ہے ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جبلی جب لندن برطانیہ میں منعقد ہوئی تو اس میں مقالہ نگار کی حیثیت سے شریک ہوئے وہاں آپ نے صدارت بھی کی اور اسی کے ساتھ مباحث میں بھی حصہ لیا۔ آپ کا مقالہ بہت ہی پسند کیا گیا اس میں تاریخ کے مختلف گوشوں سے گفتگو کی گئی تھی اسی کے ساتھ پاکستان میں مرثیہ پر جو سیمنار ہوا اس میں شرکت کی اس طرح بین الاقوامی

اور قومی سطح پر سیکڑوں سیمنار میں شرکت کی خاص طور سے آپ نے راجستھان میں جو کام کیا اردو کے ترویج و اشاعت کے لیے یادگار رہے گا۔ آپ نے تمام اضلاع میں انجمن ترقی اردو ہند کی شاخیں قائم کیں۔ کوٹہ مادھو پور اودے پور میں بہت بڑی دو روزہ کانفرنس کی وہاں انجمن ترقی ہند کے شاہ انعام الحق مرحوم صدر تھے۔ آپ اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ آپ کی علمی بصیرت، محنت اور ادبی لگن کو دیکھتے ہوئے ملک کی کئی یونیورسٹیوں اور ادبی اداروں نے ان کی خدمات حاصل کیں، اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے تدریسی خدمات کرنے کی پیشکش کی اور جسے آپ نے قبول بھی کیا۔

پروفیسر فضل امام ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ نقاد، محقق ماہر لسانیات، ادیب، دانشور اور معلم ادب ہونے کے ساتھ اعلیٰ پائے کے خطیب بھی ہیں انھیں قدرت کے طرف سے خطابت کا خدا داد ملکہ حاصل ہوا ہے۔ وہ اپنی دلکش اور خوبصورت تقریر کے ذریعہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ہنر جانتے ہیں جس موضوع پر تقریر کرتے ہیں اس موضوع پر ان کی گرفت کافی مضبوط رہتی ہے ان کی تقریر روانی اور تسلسل کا عمدہ مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی تقریر کے دوران مثالیں اور دلائل کے ذریعہ موضوع کا حق پوری طرح ادا کرتے ہیں اور ایک ایک نکتہ پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر الفاظ کے در وبست اور روانی کا ایسا مجموعہ ہوتی ہے کہ اسے آڈیو کیسٹ کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر اتارا جاتا ہے تو وہ ایک مضمون کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے ان کی تقریر میں ایسی شائستگی اور لب ولہجہ میں ایسی روانی ہوتی ہے کہ زمانہ معترف نظر آتا ہے۔ لفظ خطابت عربی کے الخطب سے نکلا ہے خطابت ایک فن ہے جس سے خطیب اپنی شخصیت اور اپنے علم کا اظہار کرتا ہے بہت سے عالم اور مفکر تو پائے جاتے ہیں لیکن یہ قوت گویائی نہیں ہوتی اور بغیر گویائی کے فکر وفن کا اظہار ناممکن

ہے۔ پروفیسر فضل امام کو یہ فن قدرت نے ودیعت کیا ہے وہ محافل اور مجالس کے نامور خطیب اور انشاء پرداز ہیں۔ جب وہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو الفاظ قطار در قطار دست ادب جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی تقریر کی اس خوبی پر مشہور، مستند اور معتبر شاعر حضرت بسمل سعیدی ٹونکی مرحوم نے ایک رباعی میں ارشاد فرمایا ہے۔

تحریر کے عنوانِ جلی فضل امام
تقریر کے والی و ولی فضل امام
اے چشم و چراغ دودمان پاکاں
منجملۂ شیعانِ علی فضل امام

بسمل سعیدی ٹونک

۱-۱۱-۷۶

پروفیسر فضل امام برصغیر ہندوپاک کے علاوہ یوروپ، فرانس، اٹلی، سنگاپور، میں بھی خطابت کے جلوے دکھائے ہیں۔ وہ ایک شعلہ بیاں مقرر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں اور گہرے فلسفیانہ مسائل پر بھی مدلل اور منطقی استدلال سے بھی کام لیتے ہیں۔ پروفیسر امام کو لفظوں کے مناسب استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ انگریزی، ہندی یا دوسری ہندوستانی زبان کے مروج لفظ کا استعمال اس کمال سے کرتے ہیں کہ ان کی نثر بول اٹھتی ہے آپ تکرار اور طوالت سے گریز کرتے ہیں۔ آپ کو تقریر کرنے کا شوق ادبی مذاکروں سے شروع ہوا۔ کالج کے مذاکرے ہوتے تھے اس سے بڑھ کر صوبائی سطح پر اور پھر قومی سطحوں میں حصہ لیا طرز خطابت مجالس اعزا سے بھی مربوط ہوگئی مجلسوں کو پڑھنے کے لئے آپ نے ہندوستان اور پاکستان اور انگلستان تک کا سفر طے کیا اور اچھے خطیب کی حیثیت سے آپ کی پذیرائی بھی ہوئی۔

تمام ذہین کاموں کو کرنے کے لئے حافظے کی ضرورت ہوتی ہے بعض دفعہ اکتساب کی ترقی کا دارومدار ذہانت سے زیادہ حافظے پر ہوتا ہے وسعت مطالعہ اس وقت کمزور ہو جاتی ہے جب حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اور قوت استدلال میں فقدان پیدا ہو جاتا ہے۔ قوت استدلال کا تعلق ذہانت سے ہے۔ پروفیسر فضل امام میں قوت حافظہ وسعت مطالعہ اور قوت استدلال تینوں صلاحیتیں بیک وقت موجود ہیں وہ کم سے کم وقت میں بھی کسی چیز کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ قوت حافظہ کے سلسلہ میں پروفیسر فضل امام خود فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک قوت حافظہ کا سوال ہے اللہ کا شکر ہے جواب تک پڑھا وہ یاد ہے جو نہیں پڑھا اس کے لئے معذرت لیکن جتنی کتب اور جتنے اشعار نظر سے گزرے ہیں خدا کا شکر ہے میرے حافظے میں ہیں اور اس وقت حافظہ سے مجھے مدد ملتی ہے۔"

آپ قوت حافظہ کے مالک ہیں اور اس وقت یادداشت اور ذہانت کی بدولت ہی اعلیٰ پایہ کے علمی اور ادبی کام انجام دیتے ہیں۔

ارتقاء ایک فطری عمل ہے جو مسلسل جاری رہتا ہے انسان اپنی ولادت سے لے کر وفات تک جسمانی اور ذہنی طور پر ارتقا کے مختلف مرحلے طے کرتا ہے۔

پروفیسر فضل امام نے ابتدا سے شعوری طور پر ادب کے شعبہ میں حصہ لیا اور اردو زبان وادب سے گہری واقفیت کی ادبی شعور کے ارتقا میں فضل امام فرماتے ہیں:۔

"ادبی شعور ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور انسانی زندگی میں جو نشیب وفراز ہوتے ہیں اور جو اس وقت کا ماحول ہوتا ہے اخبار اور رسائل میں ان کو پڑھنے کا مجھے شوق تھا خصوصی طور سے اس زمانے

میں مرادآباد سے ایک مذہبی رسالہ "نور" نکلتا تھا ادبی رسالہ میں نگار کی اہمیت تھی آج کل دہلی وغیرہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔"

عربی فارسی کی تعلیم کے لئے شمس پور اعظم گڈھ کے مولوی سید محمد صاحب قبلہ مرحوم کے یہاں آپ جاتے تھے۔ ادبی شعور کے سلسلے میں پروفیسر فضل امام صاحب کہتے ہیں:۔

"کتابیں پڑھتا تھا جہاں بھی کوئی کتاب مل جاتی تھی تاریخ ادب سے متعلق اس کو پڑھتا تھا اور بغیر کتاب کو ختم کئے دوسری کتاب نہیں اٹھاتا تھا کتاب کو ختم کرنے کے ساتھ ہی اس کا نوٹ بھی بناتا تھا اس طرح سے میرے ادبی شعور کا آغاز ہوتا ہے کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتا تھا کچھ غزلیں اور نظمیں بھی میں نے کہی ہیں قطعات اور رباعی بھی لیکن ظاہر ہے شاعری جتنی محنت و مشقت چاہتی ہے۔ شاعری چاہتی ہے کہ شاعری کا ہی ہو جایا جائے اور دوسرا کام نہ کیا جائے اس لئے اس میں میں نے زیادہ قدم آگے نہیں بڑھایا کیونکہ دلچسپی تحقیق اور تنقید سے ہوگئی اب بھی کبھی کبھار کسی کی فرمائش یا کسی کے کہنے پر یا محفل کے لئے جو مذہبی ہوتی ہیں نعتیں، منقبتیں، قطعات ورباعیات کہہ لیتا ہوں لیکن شاعری کو اپنے لئے کبھی مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دو افسانے بھی لکھے ہیں مگر افسانوں میں وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکی ایک آدھ رسالوں میں چھپے بھی مگر وہ سب ضائع ہو گئے۔"

پروفیسر فضل امام کے ادبی شعور کے ارتقاء میں دیگر بیرونی ممالک کے سفر کا اہم رول رہا ہے وہاں کی ادبی شخصیات کے اثرات بھی ان پر مرتب ہوئے۔

پروفیسر فضل امام کی تصانیف کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا

سکتا ہے کہ ان کے ادبی شعور کا ارتقاء برابر جاری رہا ہے ادب تنقید میں ان کی علمی و فکری شعور کا ارتقاء بتدریج ہوتا رہا ہے۔ پروفیسر فضل امام تحقیق، تنقید، لسانیات کے ابواب میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں، لیکن ان کا امتیاز خاص تنقید ہی ہے۔

مجموعی طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر فضل امام آج بھی علمی اور ادبی سطح پر فعال اور متحرک ہیں آپ کے ادبی شعور کا ارتقاء جاری ہے۔ اردو ادب ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر ہونے والے دیگر زبانوں کے ادب، مختلف رجحانات اور میلانات سے باخبر ہیں اور انھوں نے اپنے کو کبھی اردو والوں تک محصور نہیں کیا بلکہ دیگر زبانوں کے ادیب و مفکر سے برابر تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس علمی اور ادبی فعالیت نے انھیں عہد حاضر کا ممتاز باخبر ادیب و نقاد ثابت کیا ہے۔

ڈاکٹر کلثوم فاطمہ

پروفیسر فضل امام رضوی
مشترکہ تہذیب کی ایک مکمل شخصیت

ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہمیشہ سے مشترکہ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے یہاں پر گنگا جمنی تہذیب ہمیشہ سے نشو ونما پاتی رہی ہے یہاں کی فضاؤں میں انسانیت رچتی اور بستی ہے ہندوستان ہمیشہ سے انسانیت کا سچا ہمدرد رہا ہے قدیم زمانے سے دورِ حاضر تک ایسے نہ جانے کتنے جاں نثار اس مادرِ وطن کی مٹی سے جنم لیتے رہے ہیں جنھوں نے اس سرزمین کا حق ادا کرنے کے لئے حتی الامکان کوشش کی اور جب تک جیئے اس کوشش میں لگے رہے کہ ہندوستان کی گنگ وجمن کی وادیوں سے امن کے نغمے پھوٹتے رہیں اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں......سید فضل امام رضوی۔

سید فضل امام رضوی کا آبائی وطن اعظم گڈھ ہے فضل امام رضوی بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے میں بڑے ذہین تھے لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد درس وتدریس کے لئے راجستھان یونیورسٹی، جے پور اور الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے اردو زبان کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور سنسکرت کے علاوہ انھیں تاریخ پر بھی عبور حاصل ہے۔ اس بات کا مجھے فخر ہے کہ میں ان کی شاگرد رہی طالب علمی کا وہ زمانہ مجھے آج بھی یاد ہے جب وہ لکچر دینے کے لئے اپنے کمرے سے جلوہ افروز ہوتے تھے ان کے وجود کی توانائی ان کی رعب دار آواز

چہرے سے عیاں ہوتی تھی جب وہ کلاس میں اپنے شاگردوں کے درمیان ہوتے تھے تو ان کا رویہ خالص دوستانہ ہوا کرتا تھا۔ مضمون پر ان کی گرفت اس طرح ہوتی تھی کہ ہر ایک طالب علم پر سحر انگیزی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی بات بات میں سنسکرت کے اشلوک سنانا ان کے وسیع مطالعے کی دلیل ہے۔

عربی، فارسی ادب خصوصاً فارسی زبان و ادب پر ان کی دسترس مضبوط اور مطالعہ گہرا ہے۔ اپنے فرائض کو پوری طرح ذمہ داری سے انجام دینا اور اپنے شاگردوں کی ہر ممکن مدد کرنا ان کے شخصیت کے بڑے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے ایک لڑکے کا ان کے سپرویژن میں ریسرچ میں ایڈمیشن ہونا تھا جگہ لگ بھگ بھر چکی تھی لڑکا بہت پریشان تھا فضل امام سر کے پاس آیا اور بولا میں تھک چکا ہوں میرے لیے اعلیٰ تعلیم کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں آخری امید کے طور پر آپ کے پاس آیا ہوں۔ لڑکا ذہین تھا اس کے نئی طرز کے سوالوں سے اکثر اساتذہ خوف زدہ رہتے تھے اور اسی لیے چاہتے تھے کہ وہ لڑکا Research Scholar nominate نہ ہو مگر وہ فضل امام سر کے پاس پہونچ گیا لڑکے کی باتیں سن کر فضل امام سر مسکرائے اور بولے ٹھیک ہے لاؤ کہاں سائن کرنا ہے اور کہا من لگا کر کام کرنا میری ناک نہ کٹانا اور سائن کر دیا۔ لڑکا اچھل پڑا اور مارے خوشی کے ساتویں آسمان پر اب باری ہیڈ کی تھی جب ہیڈ نے سنا کہ یہ لڑکا فضل امام سر کے انڈر میں ریسرچ کرنے والا ہے تو پریشان ہو گئے اور فضل امام سر سے کہنے لگے سر آپ نے اس لڑکے کو! یہ لڑکا تو پاگل ہے ہیڈ کی بات سن کر سر مسکرائے اور بولے اچھا یہ لڑکا پاگل ہے۔ میری نظر میں تو کئی لوگ پاگل ہیں اور پھر بولے چلئے جیسے اتنے پاگل ایک پاگل اور سہی۔ وہاں کھڑے سبھی لوگ ان کی باتیں سن کر ہنس پڑے۔ یہ تھا ان کا جذبہ اپنے شاگردوں کی

مدد کرنے کا ایثار اور ترجیح کا۔ یہ جذبہ ان کی شخصیت کی عظمت کی دلیل ہے جو عام طور پر کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

الٰہ آباد شہر میں ہونے والی ادبی محفلوں میں ان کی موجودگی لگ بھگ برابر ہوا کرتی تھی وہ جتنا اردو اور اس کے مستقبل کے لئے فکر مند تھے اتنا ہی ہندی کے لئے بھی سب سے زیادہ فکر مند وہ گنگا جمنی تہذیب کے لئے تھے ان کا کہنا ہے کہ بیک وقت ہندوستان کی ساری عوام کو صرف ہندوستان کے بارے میں اور اس کے مستقبل کے لئے سوچنا چاہئے۔ سیاست میں بھی ان کی دلچسپی رہی مگر ادبی ذوق وشوق نے انھیں کبھی سیاست کی طرف مائل نہ ہونے دیا۔ کئی کتابوں کے مصنف، اس جید ادیب کی عظمت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فراقؔ کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ کچھ چند بڑے ناموں جیسے پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر عقیل رضوی وغیرہ کے ساتھ ایک بڑا نام سید فضل امام رضوی کا بھی ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی نے ادب کی خدمت کرتے ہوئے لگ بھگ اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ ایک طویل عرصے کے بعد وقت نے قلم اور قدموں کی رفتار کم کردی ہے مگر باوجود اس کے یہ سلسلہ اب بھی بدستور جاری ہے اور ہم بارگاہ الٰہی میں دعاگو ہیں کہ یہ سلسلہ چلتا رہے اور یہ گنگ وجمن کی سرسبز وادیاں اور بھی گلزار ہوتی رہیں۔ آمین۔

کلثوم فاطمہ

ڈاکٹر احسان حسن

پروفیسر فضل امام اور الٰہ آباد

فضل امام صاحب کا نام آتے ہی ان کی کئی کئی شخصیتیں ایک ساتھ ذہن میں ابھرنے لگتی ہیں۔ بے شک فضل امام صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ہندی، انگریزی، سنسکرت، بھوجپوری، عربی، فارسی پر امام صاحب کی دسترس کے بھی قائل ہیں اور اردو کے تو وہ پروفیسر ہیں ہی۔ شہر الٰہ آباد اور فضل امام رضوی دونوں میں ایک مشترک عنصر نمایاں ہے اور وہ ہے گنگا جمنی تہذیب۔ راقم الحروف نے بھرپور پانچ برس امام صاحب کے قدموں میں گزارے ہیں کبھی کوئی بات کوئی ایسا جملہ ان کی زبان سے ادا نہ ہوا جس سے کسی قسم کی عصبیت یا فرقہ واریت ظاہر ہو۔ میرے استاد ایک سنجیدہ اور کھلے دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ الٰہ آباد سے استادِ محترم پروفیسر سید فضل امام رضوی صاحب کس حد تک محبت کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت انھوں نے دریاباد میں عسکری صاحب کے یہاں متعدد مجلسوں میں خطاب کرتے ہوئے دے دیا ہے۔ امام رضوی کے جملے ملاحظہ ہوں ''میں نے اپنی زندگی میں جو بھی غلطیاں یا بے وقوفیاں کی ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی لکھنؤ منتقل ہونا بھی ہے۔ حضرات! آپ یقین مانیں منبر پر بیٹھا ہوں غلط بیانی نہیں کر سکتا میں لکھنؤ جا کر بہت پچھتا رہا ہوں، پھنس گیا ہوں یارو!۔''

ایک بار کسی موقع پر امام صاحب نے لکھنؤ کی فضا کے متعلق بڑی بلیغ بات

کہی تھی ''وہاں تو مسلمان رہتے ہی نہیں! لکھنؤ میں ہر انسان یا تو شیعہ ہے یا سنی''
الہ آباد میں فضل امام صاحب کا پتہ یونیورسٹی کی پروفیسرس کولونی میں ۱۰-اے بینک روڈ ہوا کرتا تھا۔ امام صاحب کے بنگلے کے بغل میں ایک شری واستو صاحب کا بنگلہ تھا وہ بھی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ دونوں بنگلوں کے درمیان شروع میں ایک دیوار تھی جس کو میرے استاد نے یہ کہتے ہوئے گرادیا تھا کہ ہمارے درمیان کسی دیوار کی گنجائش نہیں۔ آپ یقین مانیں دیوار گرانے کے لئے مزدوروں کو نہیں بلایا گیا تھا شری واستو صاحب اور فضل امام صاحب دونوں کے افرادِ خانہ نے مل کر یہ دیوار گرائی تھی۔ بینک روڈ کے علاقے میں گائے کثیر تعداد میں نظر آتی ہیں، وہاں سبزی منڈی جو ہے۔ اکثر آمد ورفت میں گایوں کی موجودگی سڑک پر بڑی دشواری پیدا کر دیتی ہے۔ استاد محترم کے ساتھ چلتے ہوئے میں جب بھی کسی گائے کو راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی ڈنڈا یا ڈھیلا اٹھاتا تو مجھے فوراً تاکید کر دیتے ''دیکھنا گائے کو چوٹ نہ لگنے پائے، بے زبان ہیں بھئی۔ ان کا کیا قصور، سب ان کے مالکوں کی لاپروائی ہے۔'' پھر وہاں سے آگے بڑھنے پر یہ بتانا نہیں بھولتے کہ گائے کو مذہبی عقیدت بھی حاصل ہے، ہندو گائے کی پوجا کرتے ہیں۔ جو لوگ فضل امام صاحب کی ہجو کیا کرتے اور اگر میں ان ہجوئیات کی گرفت کر لیا کرتا تو جب بھی استاد سے ذکر کرتا تو ہنس پڑتے اور ایک مخصوص انداز میں ''ٹھیک ہے یار، جانے دو'' کہتے ہوئے یہی شعر پڑھ دیتے۔

اپنے سر الزام کیوں لیتے ہو پھونکیں مار کر
آپ ہی بجھ جائیں گے بے نور مٹی کے دیئے

جب بھی ہم شاگردان یا پھر استاد کے احباب ان کے متعلق کچھ تعریف کے جملے کہتے تو ہمیشہ ایسی کیفیت کو استاد نظر انداز کرتے اور مسکراتے ہوئے بڑی خاکساری سے یہ شعر پڑھ دیتے۔

لوگ موتی لائے گہرے پانیوں کی گود سے
اور ہم ساحل پہ بیٹھے سیپیاں چنتے رہے

الہ آباد میں فضل امام صاحب سے محبت کرنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ استاد کے چاہنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسر سے لے کر سیاست کے سورما اور چپراسی تک۔ شعبۂ سنسکرت کے ایک پروفیسر اُما شنکر یادو کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ جہاں بھی فضل امام صاحب کو دیکھا فوراً سامنے آکر قدموں میں بیٹھ جاتے ہیں اور لاکھ روکنے کے باوجود تب تک نہیں اُٹھتے جب تک کہ اپنی پیشانی امام صاحب کے قدموں سے لگا نہ لیں۔ جب اُستاد نے مجھ کو اپنی نگرانی میں ڈی۔فل کرانا شروع کیا تو ان کے یہاں برابر میں آنے جانے لگا۔ ایک بار سردیوں کے موسم میں مَیں استاد کے گھر سے روانہ ہوا تو کولونی کے گارڈ نے مجھ کو فضل امام صاحب کے گیٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا تو آگے آکر اس گارڈ نے مجھ سے سلام کیا اور بس یوں ہی باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں اُس نے فضل امام صاحب کی دلیری کا ایک واقعہ سنایا کہ 'بہت سردی پڑ رہی تھی، گھنا کہرا تھا۔ میں رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ کوئی چور کھمبے پر چڑھ کر ٹیلی فون کے تار کاٹ رہا ہے۔ میں نے شور مچاتے ہوئے للکارا مگر پاس جانے کی ہمت نہ کر سکا کیوں کہ چور کا ایک ساتھی کھمبے کے نیچے کھڑا تھا۔ میں نے پھر شور مچایا تو دیکھا کہ فضل امام صاحب پنی دونالی بندوق لیے گھر سے نکلتے ہوئے چور کو للکار رہے ہیں۔ گیٹ سے باہر آکر صاحب نے ہوائی فائر کر دیا۔ دونوں چور بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں دوڑ کر آیا اور صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔ پوری کولونی سے اور کوئی دوسرا آدمی باہر نہیں نکلا۔ سب بے خبر ہو کر اپنے گھروں میں سوتے رہے۔''

استاد محترم ''الہ آباد یونیورسٹی ٹیچرس ایوسی ایشن (AUTA)'' صدر منتخب ہوئے۔ تب ''آٹا'' تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ اب تو دو گروپ ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری صدر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات آپ نے انجام دیں۔ یونیورسٹی کے ایک بڑے ہوسٹل ''سر سندر لال ہوسٹل'' کے آپ وارڈن / پرووسٹ Provost رہے۔ وہاں ایسی فضا کبھی نہ رہی جیسی فضل امام صاحب کے زمانے میں تھی۔ کوئی لڑکا بیمار ہوتا تو استاد اپنے اسکوٹر پر بیٹھا کر اس کو ڈاکٹر کے پاس خود علاج کے لیے لے جاتے۔ اپنے گھر سے اس بیمار لڑکے کے کمرے پر کھانا کبھی بھجواتے اور کبھی خود ہی لے کر آ جاتے کہ اسی کے ساتھ لڑکے کی مزاج پُرسی بھی ہو جائے گی۔ یونیورسٹی کے کیمپس میں چلتے ہوئے تو کبھی کسی دفتر یا بینک وغیرہ میں اکثر ایسے لوگ مل جاتے جو استاد کو دیکھتے ہی ان کی طرف کھنچے چلے آتے اور ہاتھ جوڑ کر یہی جملہ کہتے ''صاحب آپ نے فلاں عہدے پر رہتے ہوئے میری بڑی مدد کی تھی۔'' فضل امام صاحب ''اتر پردیش مادھیمک شکشا سیوا آیوگ'' کے صدر رہے اور اس بڑے عہدے پر رہتے ہوئے آپ نے بڑی ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ کسی طرح کا کوئی معاملہ کبھی سننے میں نہیں آیا۔ ورنہ تو سرکار جاتے ہی بہت سے لوگ جانچ کمیٹیوں کے نشانے پر آ جاتے ہیں۔ امام صاحب پاک صاف رہے۔ وہاں کے ملازمین آج بھی استاد کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہیں۔

الہ آباد شہر اپنے ادبی ماحول کے لیے بھی بہت مشہور ہے۔ فضل امام صاحب کے تعلق سے یہ انفرادیت تھی کہ اردو کے علاوہ ہندی ادب کی محفلوں اور تمام پروگراموں ہندی ساہتیہ سمیلن وغیرہ میں آپ خوب مدعو ہوا کرتے۔ سنسکرت شعبہ اور یونیورسٹی کے علاوہ شہر میں اگر سنسکرت کا کوئی پروگرام ہوتا تو امام صاحب کی موجودگی ضرور ہوتی۔ ان سب کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سیاسی قسم کے پروگرام میں بھی استاد کو

صفِ اوّل میں (مقررین اور سامعین دونوں اعتبار سے) ہی رکھا جاتا۔ ان زمانوں میں اور کافی حد تک آج بھی شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کی پہچان استاد کے نام سے تھی اور ہے۔ کیوں کہ اتنی ہمہ جہت شخصیت کسی کی تھی ہی نہیں۔

فضل امام صاحب کے تعلق سے ایک بات اور جو قابل تعریف اور تحریر بھی ہے وہ یہ کہ استاد کے اندر انسان دوستی کا اعلیٰ جذبہ ہے۔ یوں تو ان سے ملنے جلنے والوں میں ادبی، سیاسی، مذہبی غرض یہ کہ اعلیٰ قسم کی شخصیتیں ہوتی ہیں مگر ان بڑے بڑے لوگوں سے امام صاحب مختصر گفتگو کر خاموش ہو جاتے ہیں گو زیادہ گفتگو کے موڈ میں نہیں ہوتے۔ لیکن رکشے والوں، پھیری، فٹپاتھ والوں، مزدوروں سے دل کھول کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طبقے کے لوگوں کے لئے امام صاحب کے دِل میں ایک خاص محبت ہے۔ جب بھی سابقہ پڑتا ہے تو ان کی گھریلو زندگی سے لے کر آمدنی اور دُکھ مصیبت کی تمام باتیں بڑی ہمدردی سے کرتے ہیں۔ رکشے والوں پر ان کی خاص نظر ہے۔ کسی رکشے والے کو الہ آباد میں دیکھتے ہی استاد بتا دیا کرتے کہ یہ رکشے والا ریواں کا رہنے والا ہے کہ بہار سے آیا ہے یا پھر الہ آباد کا مقامی ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بغیر کرایہ طے کیے استاد کسی رکشے پر بیٹھ گئے ہوں۔ ہاں رکشے سے اترنے پر طے شدہ رقم سے چند روپے زیادہ اکثر ادا کرتے تھے۔ مجھے جب بھی کہیں کسی کام سے بھیجتے تو سب سے پہلے آنے جانے کے لئے رکشے کا کرایہ دیتے باقی باتیں اس کے بعد سمجھاتے بتاتے۔ میرے استاد کی قلندری ایک طرف انھیں ''بھیا بابو'' والا بناتی ہے تو دوسری طرف ان کی دانشوری انھیں دورِ جدید میں صفِ اول کے ناقدین میں شمار کراتی ہے۔ ہمارے لیے ان کی عالمانہ زندگی پر کچھ لکھنا چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی۔ بس مولیٰ سے یہی دعا ہے کہ ہم شاگردوں کی عمریں تھوڑی تھوڑی گھٹا کر ہمارے استاد پروفیسر سید فضل امام رضوی صاحب کی عمر طویل کردیں (آمین!)۔

❀❀❀

الحاج مولانا سید شمس الحسن رضوی
استاد مدرسہ ناظمیہ، لکھنؤ

پروفیسر سید فضل امام بحیثیت خطیب

خطابت بہت مشکل فن ہے۔ دراصل یہ ذہنی، علمی، ادبی، نفسیاتی اور قومی مشاہدے کا فن ہے۔ اسے ہر کس و ناکس نہیں برت سکتا۔ علامہ ابن رُشد نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ''الخطابہ'' میں اس فن کے مختلف پہلوؤں سے دل چسپ بحث کی ہے۔ اُن کے مطابق:-

''خطابت اس فن کو کہتے ہیں جس کی مدد سے اپنی بات دوسروں سے موثر ڈھنگ سے منوائی جاسکتی ہے:

ویسے اس لفظ کے لغوی معنی وعظ کہنا یا خطبہ پڑھنا ہے۔

"اخطب یخطب خطبتے وخطبا و خطابتے اھی وعظ قرا الخطبته علی الحاضرین۔ یقال خطب القوم فی القوم۔" [1]

انگریزی، عربی، اردو اور فارسی وغیرہ میں اس فن سے متعلق بہت سے تصانیف ہیں۔ جس میں خطابت کے دو اہم قرینے بتائے گئے ہیں۔

(۱) حقایقی (۲) ابلاغی

''حقایقی'' سے ایسے واقعات اور حالات عبارت ہیں جس سے کسی مخصوص عمل یا روش کا اپنانا مخاطب کے لیے لازمی ہو جائے۔

''ابلاغی'' سے مراد..... اظہار خیال و مطالب کے لیے مناسب الفاظ خصوصی اندازِ بیان اور منفرد لب و لہجہ ہے۔ جس سے کہ بات آسانی سے پہنچ سکے۔

یعنی ایسا اندازِ بیان جو دلوں کو گرمائے، کسی بات کی وضاحت کرے اور اُسے باور کرانے میں مفید ہو۔ تاثیر پیدا کر کے سامعین اور ناظرین کو مخصوص عمل پر آمادہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

خطابت کے رموز و نکات پُر پیچ ہیں۔ یہ وصل کی طرف بھی مائل کر سکتی ہے اور آمادۂ پیکار بھی کر سکتی ہے یہ شاخِ گل بھی ہے اور شمشیر بے نیام بھی۔ خطابت مردہ قوموں کو بیدار کرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ دلوں میں ولولہ اور حوصلہ بھی پیدا کرتی ہے۔ مصائب اور شدائد میں تسلی، اور تشفی کا موثر ذریعہ بھی بنتی ہے۔ صبر و ضبط و تحمل و استقلال کا درس بھی دیتی ہے اور سنان و شمشیر، تیر و تفنگ اُٹھانے کا حوصلہ بھی بخشتی ہے۔ نظامِ اخلاق کو درست کرتی ہے۔ عظمت فکر نیز قوتِ عمل عطا کرتی ہے ..... ایک لشکر جرارہ وہ کام نہیں کر سکتا جو ایک اچھا خطیب اپنی خطابت کے جوہر سے انجام دے سکتا ہے۔

پروفیسر فضل امام کی خطابت اور خطابیہ انداز اپنے موضوع کی پوری تشریح و توضیح مدلل انداز سے کرتا ہے۔ اُنھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لیے اُن کا لسانی ادراک بڑا قوی ہے۔ زبان و ادب کے بڑے معتبر اور مستند اُستادوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی مولانا سید محمد صاحب قبلہ مرحوم و مغفور ابن حضرت مولانا سید محمد رضا صاحب قبلہ مرحوم و مغفور سابق پرنسپل سلطان المدارس لکھنؤ سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ موصوف کی تقریروں میں تاریخی استدلال استنباط عقلی اور فکری اپنے معراج کمال پر رہتی ہے۔

واقعات کی تشریح و توضیح، علمی اور ادبی معیار سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ صرف اُردو ہی نہیں انگریزی اور ہندی کے بھی بہترین خطیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ہندی اور سنسکرت کے عالم بھی اُن کے مداح ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا مذاہب اور زبانوں کا تقابلی مطالعہ بڑا مضبوط اور مستحکم ہے جس کی مدد سے وہ اپنی تقاریر کو موثر بنا دیتے ہیں۔ اُن کا حافظہ بڑا قوی ہے فارسی اور اُردو کے اشعار انھیں ازبر ہیں جنھیں وہ موضوع کی مطابقت سے پڑھ کر اپنی خطابت میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر حیدر علی خاں

بے مثال اُستادِ محترم

میری تعلیمی زندگی میں بہت سے اساتذہ سے سابقہ پڑا ہے، لیکن میں اس بات کو بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایم۔ اے (اُردو) اور ڈی۔ فل کے نگراں الحاج پروفیسر سید فضل امام رضوی صاحب میرے لیے ایک مثالی اُستاد ثابت ہوئے۔ جن کی شخصیت کے لافانی نقوش میرے دل پر ثبت ہیں۔ یہ نقوش کارزارِ حیات میں آج بھی ایک روشن منارے کے مانند جگمگا رہے ہیں ان کے کردار و عمل کے پرتو کا یہ اثر ہے کہ آج بھی میرے اعزا و اقارب اور احباب جب بھی مل بیٹھتے ہیں، استادِ محترم کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے ضرور ہوتا ہے۔ وہ عقیدتاً فقہ جعفری سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کے زیادہ تر شاگرد اہل سنت و جماعت رہے ہیں لیکن ان کی انسان دوستی کسی بھی طرح کے مسلکی اختلافات کو کبھی بھی پسند نہیں کرتی۔ اپنے شاگردوں کی مدد کے لیے ہمہ وقت دامے، درمے، قدمے اور سخنے تیار رہتے ہیں۔ وہ ایک بے لوث اور درویش صفت انسان ہیں۔ رموزِ قلندری سے واقف ہیں۔ اس لیے ذاتِ پروردگارِ عالم پر یقین کامل رکھتے ہیں اور تن بہ تقدیر زندگی گزارنے کے قائل ہیں۔

استادِ محترم کا درس فکروفن کے اعلا مدارج کو پیش کرتا ہے۔ اشعار اور عبارتوں کی تشریح، توضیح و تصریح اس انداز سے کرتے ہیں کہ لفظ و معنی کے وسعتوں کا راز کھلتا ہے۔ ان کا عمیق مطالعہ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، بھوج پوری، راجستھانی اور

انگریزی زبانوں کا ہے۔ اس کی مدد سے وہ فن شعر کی نزاکتوں سے طلباء کو واقف کراتے ہیں۔موصوف کی پاک دامانی حق گوئی اور بے باکی بہت مثالی ہے اور پوری یونیورسٹی کے طلباء و طالبات ان کی پاک بازی کا کلمہ پڑھتے رہے ہیں۔آج تک ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں ہے۔مزاج میں مروت اور دوسروں کی مدد کا جذبہ اس قدر ہے کہ کبھی کبھی اپنے کو بھی جوکھم میں ڈال کر دوسروں کی تکلیف کو دور کرتے رہے ہیں جس کا میں عینی شاید ہوں۔بہت واقعات ہیں جس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

آج کی اس مفاد پرست دُنیا میں اُستاد محترم ہر چیز سے بے نیاز ہیں وہ کسی طرح کے تصنع اور تملق سے بہت دور ہیں۔طبیعت اور مزاج میں کمال کا استغنا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے تمام ممکن عہدوں پر مامور رہے،اور اُن کی سادگی اور درویشی ہمیشہ قایم رہی جس کہ مثال آج کی اس دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔

راقم السطور اُستاد کے گھر کی ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ روابط آج بھی الحمداللہ قائم ہیں۔علامہ اقبال نے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اپنے استاد مولانا سید میر حسن شاہ کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے۔اور ایک شعر میں فرمایا ہے کہ ؎

مجھے اقبال اسی سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُن کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

ہاں ایک جگہ اقبال نے مزید اپنے استاد سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

وہ شمعِ بار گہہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

یہ احقر بھی استاد محترم پروفیسر سید فضل امام کی نگاہِ تربیت اور اور شفقت سے فیض یاب ہوا ہے جس کا اعتراف نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔

پروفیسر علی احمد فاطمی
صدر شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی

فضل امام یعنی کرپارام

کسی بھی فرد سے تعلقات کی مدت طویل ہو اور کثیر بھی تو حافظہ کا ساتھ دے پانا مشکل ہو جاتا ہے اردو کے ممتاز ادیب، ناقد، محقق، مفکر، مقرر پروفیسر فضل امام رضوی سے میرے تعلقات اتنے پرانے اور گہرے ہیں کہ ان کی قدامت اور گہرائی میں ڈوبا تو جا سکتا ہے اُبھر کر شمار و قطار کر پانا مشکل ہے اس لئے یاد نہیں کہ کب، کہاں اور کس مقام پر پہلی ملاقات ہوئی۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ بعض لوگوں سے بہ نفس نفیس ملنے سے قبل ہی مل چکے ہوتے ہیں اور پھر جب پہلی بار روبرو ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دہائیوں سے ملتے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے سے ہی محبت اور قربت ہے۔ ایک عجیب سا اپنا پن محسوس ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یا رشتہ فضل امام صاحب کے ساتھ رہا ہے۔ یادوں اور ملاقاتوں کی اس بھیڑ میں واقعی یاد نہیں کہ پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ یاد کرنے کی ضرورت بھی نہیں اس لیے کہ جذباتی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے ہم اس قدر قریب رہے کہ یاد کا دخل نہ کے برابر رہا۔ یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو کسی اعتبار سے دور ہو گیا ہو۔ فضل امام صاحب اور میں ہمیشہ قریب رہے۔ ہر اعتبار سے قریب۔

اتنا ضرور یاد ہے کہ میں ابھی ایم۔ اے کا طالب علم تھا اور ہمارے گھرے

دوست گورکھپور کے افغان اللہ خاں جوان دنوں فراق گورکھپوری پر برائے پی ایچ ڈی تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا اکثر الہ آباد آنا جانا ہوتا۔ ہم لوگ گاہے بگاہے فراق صاحب کی حضور میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ افغان اللہ کے ساتھ کئی بار فراق صاحب کے پاس گئے اور بہت ساری باتیں سیکھنے کو ملیں بہر حال افغان اللہ سے دوستی ہوتی گئی آخر تک قائم رہی۔ افغان اللہ سچے اور کھرے انسان تھے جس سے دوستی کرتے تو پھر دل سے کرتے اسی طرح دشمنی کا بھی حال تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دشمن کم سے کم تھے۔ بہر حال انہیں کی زبانی میں نے پہلی بار جن دو شخصیتوں کا ذکر بار بار سنا ان میں ایک فضل امام صاحب تھے دوسرے محمود الٰہی مرحوم۔ محمود الٰہی صاحب اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو تھے اور معروف ادیب و محقق فضل امام صاحب جے پور یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر تھے۔ فضل امام اور افغان اللہ میں جو چیزیں مشترک تھیں ان میں اول تو یہ کہ یہ دونوں ہی پروفیسر محمود الٰہی کے شاگرد تھے۔ دوئم یہ کہ دونوں کا ہی تعلق اعظم گڈھ اور گورکھپور یونیورسٹی سے تھا۔ دونوں کے مزاج میں سادگی، خلوص اور لگ بگھا پن کہ بس جس سے دوستی اور رشتہ ہے تو بے سود و زیاں سے بالاتر........ اور بھی کچھ چیزیں۔ افغان اللہ سے ہی پتہ چلا کہ فضل امام نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد محمود الٰہی کی نگرانی میں امیر اللہ تسلیم کی حیات اور شاعری پر پی ایچ ڈی کر کے اب وہ راجستھان یونیورسٹی جے پور میں اردو کے استاد ہیں۔ محمود الٰہی صاحب کے بارے میں کل بھی اور آج بھی یہ سن رکھا تھا اور دیکھا بھی کہ وہ اپنے شاگردوں کا بے حد خیال کرتے ہیں ان کی پڑھائی لکھائی سے لے کر ان کی ملازمت تک کا خیال.... یہی وجہ ہے کہ آج پورے ہندوستان میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ شمال کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں محمود الٰہی کا کوئی نہ کوئی شاگرد ضرور مل جائے گا۔ فضل امام پر بھی ان کا فضل تھا جس کو زندگی بھر فضل امام یاد کر کے

نبھاتے رہے اور استاد کے سامنے سرِ عقیدت خم کرتے رہے۔ تو فضل امام جے پور میں تھے ادھر میں الہ آباد میں ایم۔اے، ڈی۔فل کرنے کے بعد سینٹ جانس کالج میں لکچرر ہو گیا۔ انھیں دنوں فضل امام صاحب نے جے پور میں انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام ایک سیمنار کا اہتمام کیا اور ہم سب لوگوں کو مدعو کیا۔ گلابی شہر جے پور دیکھنے اور گندمی شخصیت فضل امام سے ملنے کی خواہش جے پور لے گئی۔ سیمینار میں اور بھی افراد تھے۔ الہ آباد سے ہمارے استا پروفیسر سید محمد عقیل کچھ اور احباب بھی پروفیسر وہاب اشرفی بھی تھے، کچھ اور لوگ بھی۔ ادبی سرگرمیوں سے میری بھی دلچسپی رہی ہے۔ مذاکرے مشاعرے کا اہتمام بھی کرتا رہا ہوں۔ اس لیے جب میں نے فضل امام کو جے پور میں سرگرم اور مقبول دیکھا تو دلی خوشی ہوئی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کی شخصیت صرف شعبہ یا یونیورسٹی تک محدود نہ تھی بلکہ شہر کے ادبی اور سماجی حلقہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ جسمانی طور پر جتنے چوڑے چکلے تھے ذہنی طور پر بھی اتنے ہی وسیع اور فراخ بھی۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حرف ولفظ یا زبان و بیان کا پر لطف اظہار کر کے غیر کو بھی اپنا بنا لیتے تھے۔ جے پور کے اس مذاکرے میں دو تین دن کے قیام کے دوران فضل امام اچھے لگے، اچھا تاثر بنا۔ فضل امام بڑے خلوص سے ملے اور چونکہ میں بھی ادیبانہ طور پر جدو جہد کر رہا تھا اور مضامین لکھنے، چھپنے اور شناخت قائم کرنے میں مصروف عمل تھا۔ اس لیے جلد ہی فضل امام سے مزید واقفیت و تعلقات کے در کھلنے لگے اور رسم و راہ بڑھنے لگی۔ اُس طرز پر میں نے بھی آگرہ میں کام کرنا شروع کر دیا۔ سیمنار مشاعرے کئے ایک سچ یہ ہے کہ میرا دل آگرہ میں نہ لگتا۔ علی گڑھ قریب ہے ہر ہفتہ وہاں چلا جاتا اور احباب میں دو تین گذار کر پھر واپس آگرہ آجاتا۔ میرا بھی جی چاہنے لگا کہ میں بھی یونیورسٹی میں پہنچوں علی گڑھ یا الہ آباد۔ شاید یہ احساس فضل امام صاحب کو بھی رہا حالانکہ وہ آٹھ نو سال سے جے پور یونیورسٹی میں تھے اور ان کے قدم

جے پور میں جم چکے تھے لیکن اعظم گڈھ، گورکھپور اور محمود الٰہی ان کی ایسی کمزوری تھے کہ ان سے الگ رہ پانا ان کے لیے بہر حال مشکل تھا۔ اس لیے فضل امام صاحب جے پور سے نکلنے کی فکر میں لگے رہتے۔ میں تین سال کے بعد ۱۹۸۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی آ گیا اس کے چند برسوں کے بعد ہمارے شعبہ میں ریڈر کی جگہ خالی ہوئی۔ استاذی سید محمد عقیل صدر شعبہ تھے انھیں کسی سمجھدار اور پڑھے لکھے استاد کی ضرورت تھی۔ ان کی نگاہِ انتخاب فضل امام پر پڑی۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۸۶ء میں فضل امام کا تقرر ہو گیا اور وہ جے پور میں چودہ برس (۱۹۸۶-۱۹۷۲ء) کا بن باس کاٹ کر الہ آباد آ گئے اور اپنے وطن اعظم گڈھ اور مادر علمی گورکھپور سے قریب ہو گئے۔ ان کے آنے سے شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی میں نہ صرف رونق آئی ساتھ ہی مجھے ان کی قربت کا موقع ملا۔ ابتدا میں فضل امام کا قیام میرے ساتھ ہی رہا۔ میں ان دنوں محلّہ دریا آباد میں رہتا تھا جو میری سسرال تھی اور دادیہال بھی، بڑا گھر تھا کئی کمرے تھے۔ فضل امام کمرے میں کئی ماہ رہے۔ ساتھ کھانا پینا ہوتا۔ ساتھ یونیورسٹی آتے جاتے، محفل، مذاکرے، پڑھنا لکھنا سب ساتھ ساتھ ہوتا چنانچہ ان صورتوں اور قربتوں میں فضل امام صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملے۔ چند ماہ کے بعد انھوں نے بیوی بچوں کو بھی بلا لیا اور دوسرے کرایے کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

صاف اندازہ ہوا کہ فضل امام سادہ طبیعت اور مشرقی و مذہبی مزاج کے انسان ہیں نماز روزہ پابندی سے کرتے، مجلس محرم اس سے بھی زیادہ۔ ان سب معاملات میں وہ راسخ العقیدہ ہیں۔ پکے مسلمان لیکن اچھے انسان۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا لیکن میں ان چیزوں سے گھبرایا نہیں اس لیے کہ میرا خاندان بھی بیحد مذہبی ہے اور آدھا شیعہ بھی میرا بچپن ننیہال (صفی پور۔ اُناؤ) میں گذرا جہاں شیعہ حضرات زیادہ ہیں۔ مجلس محرم کے سایے میں گذرا ہے اس لیے میرے لیے زیادہ زحمت نہ تھی

البتہ میری بیوی کے لیے ضرور زحمت تھی اور پابندی بھی لیکن وہ بیحد شریف، مہذب اور مہمان نواز خاتون ہیں اس لیے وہ یہ سارے کام خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔ اپنے تمام تر مذہبی رسومات اور روایات کے باوجود فضل امام تنگ نظر اور دقیانوس ہرگز نہیں ہیں۔ انھوں نے مذہب، مسلک کو محض عقیدت سے نہیں بلکہ تعقل و تفکر کے حوالے سے لیا ہے۔ پوری کشادہ ذہنی اور انسان دوستی کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ ان کے تعلقات ہر قوم اور طبقہ کے لوگوں سے رہے ہیں اور آج بھی ہیں پوری خوش دلی اور خوش فکری کے ساتھ۔ ان کی یہ انسان دوستی اور روشن خیالی ہی انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قریب لائی اور وہ باقاعدہ اس سے وابستہ رہے۔ لندن کی گولڈن جبلی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ ۸۷ء میں جب ہم نے الہ آباد میں انجمن کی گولڈن جبلی کانفرنس کا انعقاد کیا تو وہ اس میں پیش پیش رہے۔ پورے طور پر ہمارے ساتھ رہے۔ بعد میں وہ انجمن کی الہ آباد شاخ کے پہلے نائب صدر، اس کے بعد صدر ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ صدر ہونے کے بعد وہ مصروف ہوتے گئے اور انجمن کی طرف توجہ کم ہوئی تو میں نے ان کو روکا ٹوکا بھی وقتی اختلافات بھی ہوئے جو جلد ہی تحلیل بھی ہو گئے۔ انھیں ماہ و سال میں ہم نے یہ بھی جانا کہ وہ ہندی زبان بہت اچھی جانتے ہیں۔ سنسکرت بھی راجستھانی بھی کچھ اور مقامی بولیاں بھی انھوں نے اس تعلق سے کچھ کورس وغیرہ بھی کر رکھے تھے۔ الہ آباد ہندی زبان و ادب کا مرکز ہے اس لیے یہاں آنے کے بعد ان کی ہندی دانی کے جوہر کھلنے لگے، جا بجا ہندی/اردو کے جلسوں میں جہاں وہ اردو کے اسکالر کی حیثیت سے بلائے جاتے وہ یہ ثابت کرنے میں لگ جاتے کہ وہ جتنی اردو جانتے ہیں اس سے کم ہندی سے واقف نہیں۔ اکثر عام گفتگو میں بھی ہندی، سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے تو عجب لطف آتا۔ یہ لطف ہندی والوں کو زیادہ آتا۔ ان کے لیے حیرت کی بات ہوتی اس سے زیادہ مسرت کی

بھی۔ ہندی ہم بھی جانتے ہیں اور پورا تعلیمی کیریئر ہندی میڈیم میں ہی طے ہوا ہے لیکن فضل امام جیسی ہندی ہم لوگ نہیں بول پاتے ہیں۔ وہ گاڑھے گاڑھے الفاظ نکلتے کہ حلق میں خراشیں پڑ جاتیں اور وہ کھانسنے لگتے۔ حلق اور کھانسی کا مرض ان کا پرانا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی دوا اپنے پاس رکھتے ہیں کھاتے پیتے رہتے ہیں لیکن کھانسی اچھی ہونے کا نام نہ لیتی۔ وہ یہ بات کبھی نہ سمجھ سکے کہ ان کے حلق کا مرض دراصل گاڑھی ہندی بولنے کی وجہ سے ہے۔ ابتدا میں الہ آباد کا ہندی طبقہ خوش ضرور ہوا اور انھیں فضل امام کی جگہ کرپارام کہنے لگا جو فضل امام کا ہندی ترجمہ ہے لیکن رفتہ رفتہ انھیں یہ احساس ہونے لگا یہ رواں دواں اور محض ہندی نہیں بلکہ سنسکرتائی ہندی ہے جسے اصل ہندی والے بھی کم بول پاتے ہیں اس لیے جلدی وہ کرپارام کی جگہ پنڈت کرپارام ہو گئے۔ ایک بار یہ بھی ہوا کہ ہندی کے کسی ایک جلسہ میں فضل امام نے گاڑھی ہندی میں تقریر کی تو حسب معمول سامعین متاثر ہوئے اور اس سے زیادہ متحیر۔ ہندی کی ممتاز افسانہ نگار ممتا کالیہ جلسے کی صدارت کر رہی تھیں، اپنی صدارتی تقریر میں از راہِ لطف کہہ گئیں کہ فضل امام کی تقریر کس زبان میں تھی میں سمجھ نہ سکی اگر وہ اس کا ترجمہ ہندی میں کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ لوگوں نے خوب لطف لیا۔ سچ بات یہ ہے کہ ہندی فضل امام کی مادری زبان نہیں ہے۔ آسمانی ہے اسی لیے کتابی ہے لیکن اردو جو ان کی مادری زبان ہے اس زبان میں کی گئی تقریر بھی اکثر کتابی زبان میں ہی ہوتی۔ وہ عربی اور فارسی اچھی جانتے ہیں۔ مدرسہ کی تعلیم حاصل کیے ہوئے ہیں اس لیے ان کی اردو میں بھی عربی اور چربی نظر آنے لگتی ہے جو کبھی کبھی مصنوعی سی لگنے لگتی ہے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ یہ عادت اب ان کی فطرت بن چکی ہے اس لیے ہمیں معلوم ہے کہ اب تصنع نہیں ہے فطرتاً ہے۔ بہر حال یہ لطف کی باتیں اپنی جگہ پر لیکن اپنے مزاج وتہذیب، اخلاق وآداب اور شستہ چار سے وہ دیکھتے دیکھتے یونیورسٹی اور شہر میں مقبول ہوتے گئے۔ ہندی اور دیگر مضامین کے استادوں، لیکھکوں یہاں تک کہ

سیاست دانوں سے ان کے قریبی تعلقات ہوتے گئے۔ جن کی دو مثالیں یادگار ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

۱۹۹۲ء میں جب بابری مسجد کی شہادت کا المناک حادثہ ہوا تو تمام سیکولر لوگ بالخصوص مسلمان اس اندوہناک حادثہ سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ چاروں طرف عجیب سا ماحول بن گیا تھا یونیورسٹی کا ماحول بھی متاثر تھا لیکن تعریف کرنی ہوگی سیکولر ہندو اساتذہ کی جو کئی قسم کے سیکولر نوعیت کے فورم سے اس حادثہ کی مذمت کر رہے تھے اور سیکولر فضا قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ بغیر اعلان کیے دو خیموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک طرف سیکولر اور ترقی پسند اساتذہ تو دوسری طرف ایسے اساتذہ جو ہندو ازم اور برہمن ازم وغیرہ پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ٹھیک اس حساس ماحول میں الہ آباد یونیورسٹی اساتذہ کی ایسوسی ایشن (AUTA) کا الیکشن ہوا، کچھ تیز طرار سمجھدار اور سیکولر کردار والے اساتذہ نے سوچ سمجھ کر فرقہ پرستوں کو شکست دینے کی غرض سے فضل امام صاحب کو صدر کی پوسٹ کے لیے الیکشن میں کھڑا کر دیا اور وہ ہندی بولتے بولتے کھڑے بھی ہو گئے۔ ہم سب حیران و پریشان کہ اس نازک ماحول میں وہ کیا جیتیں گے۔ مسلمان اساتذہ تو گنتی کے ہیں۔ ترقی پسند بھی کتنے ہوں گے، کچھ ایسے ترقی پسند بھی ہوتے ہیں کہ کرائسس میں وہ ترقی پسند کم مذہبی زیادہ ہو جاتے ہیں لیکن واقعی حیرت کا مقام تھا کہ یہ الیکشن فضل امام نے لڑا چند ہندو اساتذہ جن میں عورتیں بھی شامل تھیں اُن سب نے جم کر فضل امام کی حمایت کی، میں پھر بھی مایوس تھا اور مجھے مصلحتاً بہت زیادہ آگے آگے رہنے کو منع کیا گیا کیونکہ میں بدنامی کی حد تک ترقی پسند تھا۔ بہرحال اس کشاکش اور جدوجہد کے بعد جب نتیجہ نکلا تو فضل امام الیکشن جیت چکے تھے۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ غالباً پہلی بار کوئی مسلم پروفیسر اساتذہ کی انجمن کا صدر بنا

تھا جسے اخبار والوں نے خوب خوب پیش کیا۔ ہندی اخباروں میں جب تصویر چھپی تو وہ فضل امام کم کرپارام زیادہ لگ رہے تھے۔ اُس زمانے میں ملائم سنگھ یادو کی حکومت تھی۔ ممتاز سماج وادی لیڈر جنیشور مسرا زندہ تھے اور الہ آباد میں ہی رہتے تھے۔ ان کی نظر فضل امام پر پڑی اور دیکھتے دیکھتے وہ سماج وادی پارٹی لیڈران کے بھی بہت قریب ہو گئے۔ میں بھی تھوڑا بہت سماج وادی نقطۂ نظر سے قریب ہوا لیکن فضل امام کی نگاہیں کہیں اور بھی تھیں چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ سکنڈری ایجوکیشن کمیشن کے چیئر مین بنا دیے گئے۔ ہم سب خوش تو ہوئے لیکن مجھے یہ لگا کہ یہ محل، یہ فیصلہ زیادہ درست نہیں کہ کمیشن کے دیگر ممبران اور رفقاء سب کے سب کرپٹ اور لالچی تھے۔

لیکن میں خاموش رہا کہ وہ مجھ سے سینئر تھے اور پروفیسر تھے۔ چاروں طرف ان کا شور وغوغا تھا۔ سیاسی اور سماجی ماحول میں کچھ زیادہ اور میری نگاہیں اُن کو شعبۂ زبان وادب میں سر بلند دیکھنے کی تھیں، ایک پروفیسر ہی نہیں ایک اسکالر کی شکل میں اور اسکالرشپ صرف زبان دانی سے نہیں آتی ہمہ دانی سے آتی ہے۔ اس کے راستے کچھ اور ہوتے ہیں جہاں ایثار وقربانی کا رول کچھ زیادہ ہوا کرتا ہے۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ چیرمین شپ کی مدت مختصر ہی رہی اور وہ جلد ہی اس حصار سے باہر نکل آئے۔ اب ان کی توجہ شعبہ پر تھی۔ سید محمد عقیل کے ریٹائرمنٹ کے بعد جعفر رضا صدر شعبہ ہوئے جو کسی بنا پر عقیل صاحب کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی انھیں ناپسند کرتے تھے کہ ناپسندی اور بڑبولا پن ان کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ اسی لئے جواباً وہ بھی ناپسند کئے گئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ فضل امام کی شخصیت میں کچھ ایسا کرشمہ تھا کہ وہ عقیل صاحب کے حمایتی ہوتے ہوئے بھی جعفر رضا کے دور صدارت میں بہ آسانی پروفیسر ہوئے اور میں ریڈر نہ بن سکا جس کا مجھے کوئی قلق نہیں۔

وہ ہر وائس چانسلر کے قریب ہوتے کبھی پرا کٹر ہوتے کبھی کچھ اور بارے کسی طرح جعفر رضا کا دور ختم ہوا تو فضل امام صدر شعبہ ہوئے اور مختصر سی مدت میں ہم دونوں نے مل کر کئی اہم کام کیے جس میں ایک اہم کام احتشام حسین سیمنار تھا جو بہت کامیاب ہوا۔ شعبہ میں ایک بڑا ہال بنا جس کی تعمیر کا دعویٰ تو جعفر رضا کرتے تھے لیکن سنگ بنیاد پر پروفیسر فضل امام کا نام درج ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا اس لیے کہ فضل امام اپنی ذات سے شعبہ کو فیض پہنچا رہے تھے اور جعفر رضا شعبہ کی وساطت سے اپنی ذات کو، اس کا ثبوت فضل امام کی وہ کتاب (امعانِ نظر) ہے جو شعبۂ اردو کے نام معنون ہے جبکہ وہ اس شعبہ کے طالب علم نہیں رہے اور استاد کی حیثیت سے محض چودہ برس ہی رہے جعفر رضا اسی شعبہ کے طالب علم رہے ہیں تیس برس سے زیادہ استاد رہے لیکن وہ شعبہ کی فضا کو مکدر ہی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضل امام آج بھی شعبہ میں آتے جاتے ہیں عزت ومحبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور جعفر رضا بقول نظیر اکبر آبادی ؎ ''کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے'' کے مصداق بن گئے۔ شعبہ سے سچائی اور گیرائی سے وابستگی کی وجہ سے جہاں کچھ اچھے کام ہوئے وہیں فضل امام نے علم وادب کی دنیا میں کئی اہم کتابیں پیش کیں۔ انیس پر تو وہ بہت اچھا کام کر ہی چکے تھے جس پر انھیں ڈی۔ لٹ کی ڈگری ملی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک اہم کتاب مشرقی انتقادیات لکھی۔ اس موضوع پر ہمارے یہاں کم کام ہوئے ہیں۔ یہ اہم کام وہ اس لیے بھی کر سکے کہ وہ عربی فارسی قدیم وکلاسیکی ادب پر اچھی نگاہ رکھتے ہیں اور فضل امام میں باطنی سطح پر معروضی نوعیت کے تجزیے کا مادہ موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تجزیہ اکثر تحقیقی زیادہ ہوتا ہے تنقیدی نسبتاً کم اور اس سے بھی زیادہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کے باطن و خارج کی متصادم ہوتے ہیں۔ تضادات وتصادمات کا یہی وہ نازک موڑ ہے جہاں

فنکار و قلمکار کو اپنی انانیت و مقصدیت کو بالاتر رکھنا پڑتا ہے۔ فضل امام نے یہ کیا اور کئی بار کیا کہ اصلاً وہ مذہبی انسان ہیں اور خوفِ خدا رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں کہ فضل امام بھی ہماری طرح انسان ہیں اور انسان تو خاک کا پتلا ہے غلطیاں کرتا ہے اور اس سے سیکھتا بھی ہے۔

پروفیسر ہو جانے اور پھر ریٹائر ہو جانے کے بعد عام استاد پڑھنا لکھنا بھول کر یا تو خدا کی خدمت میں لگ جاتے ہیں یا دنیاداری و رشتہ داری وغیرہ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ وہ واقعی رائٹر ہیں ایک جینیون رائٹر۔ ادھر ان کی کئی کتابیں جو اقبال اور جدید مرثیہ سے تعلق رکھتی ہیں ریٹائرمنٹ کے بعد ہی آئی ہیں اور عمدہ کاوشیں ہیں۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ شعبہ سے منسلک ہونے کے ناتے وہ مرثیہ، جدید مرثیہ، مرثیۂ انیس وغیرہ پر اچھے کام کر سکتے ہیں لیکن جب میں نے ان کی اقبال پر کتاب دیکھی اور مضامین پڑھے تو دل خوش ہو گیا۔ یہ خوشی اس بات پر کم تھی کہ انھوں نے اقبال کا مرد مومن اور مسلک تلاش کیا تھا بلکہ اس لیے زیادہ تھی کہ انھوں نے بڑے سلیقے سے اقبال اور عشق اہل بیت اور غم شہید کربلا ذر مقصود اقبال کو بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا تھا اور یہ پیش کش فضل امام کے ذریعہ ممکن تھی اس پیش کش کو انھوں نے آج کے نظریاتی اژدہام سے جوڑ کر دیکھا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"آج کی اس دنیا میں جبکہ نظریات کا اژدہام ہے عالم اسلام میں بھی نئی نئی تحریکیں جنم لیتی جا رہی ہیں اور ماہِ محرم کا چاند آسمان نیلی فام پر نمودار ہوتے ہی بھانت بھانت کے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگتی ہے انھیں علامہ اقبال کے نظریۂ غمِ محمد اور آل محمد کو دیکھنا سمجھنا اور برتنا چاہیے تا کہ حقیقت غم حسین سمجھ میں آسکے اور ملت اسلامیہ اس ٹھوس اور اٹل حقیقت سے اپنی زندگی اور عاقبت سنوار سکے بقول اقبال۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

اس خیال میں شیعت کم انسانیت زیادہ ہے۔ یہ غیر محدودیت ہی ان کے ترقی پسند مسلک کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر ان کے ترقی پسند مسلک کو اور قریب سے دیکھنا اور سمجھنا ہے تو ان کے مضامین کے تازہ ترین مجموعہ ''امعانِ نظر'' کو ملاحظہ کیجئے جس میں واقعی نظر کی گہرائی ہے۔ نظریاتی وابستگی اور علمی وتنقیدی سنجیدگی، پختگی و بالیدگی نظر آتی ہے آپ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی علمیت، معروضیت، مشرقی اندازِ نظر اور گہرے تجزیاتی انداز سے انکار نہیں کر سکتے بس گڑبڑ وہاں ہوتی ہے جہاں وہ مخالف اور مغربی تھیوریز سے اختلاف کی حدوں سے آگے بڑھ کر طنز و تمسخر کی راہ پر آجاتے ہیں اور اچانک ساختیات کو واہیات کہنے لگتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل میر، اکبر، احتشام حسین، سجاد ظہیر، کبیر وغیرہ پر مضامین ان کی دلچسپیوں کی تہہ داری اور موضوعات کی رنگا رنگی کو دیکھ کر داد دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

فضل امام جس مشرقی تہذیب، علم و فکر، تعلیم و تدریس سے زندگی بھر وابستہ رہے آج بھی اسی طرح سے وابستہ ہیں، پڑھتے لکھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کے پیچ وخم اور سرد و گرم سے وہ بھی دوچار ہوتے رہتے ہیں ایسے میں ان کی بیگم یعنی ہماری بھابھی صاحبہ انھیں بڑا سہارا دیتی ہیں اسی وجہ سے ان کے پڑھنے لکھنے میں کمی نہیں آسکی ہے۔ ان کا قلم اور قدم آج بھی مصروف کار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اب تجربے، عمر اور فکر کی جس منزل پر پہنچ چکے ہیں اس میں تبدیلی آنا مشکل ہے۔ افکار و نظریات کی جس بلندی پر پہنچ چکے ہیں وہاں سے پلٹ کر آنا ممکن نہیں اور اٹھنا بیٹھنا یوں بھی ان کی فطرت میں نہیں ہے۔ یہ ایک خوبی کی بات تو ہے لیکن زندگی کے اپنے

تقاضے اور مطالبے ہوا کرتے ہیں وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہے تو بدلتی بھی ہے اسی کے ساتھ ساتھ علم وفن کی دنیا میں بھی بدلاؤ آتے ہیں ان بدلاؤ کو بھی سنجیدگی سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس نئے پن میں انسانی فکر وفطرت کے سایے ملتے ہیں تو کچھ روشنیاں بھی...... مگر ہوا کچھ یوں کہ آج کا جو ادبی ماحول ہے۔ یونیورسٹیاں اور اس کے اساتذہ جس بھیڑ بھاڑ والی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اس میں بازار واد اور مفادات زیادہ دکھائی دے رہے ہیں اس ماحول میں فضل امام، سید محمد عقیل، محمود الحسن رضوی جیسے سنجیدہ وخاموش طبع اساتذہ اور اسکالرز مس فٹ ہیں شاید انھیں اس کا احساس بھی ہے لیکن اس کا قلق ہرگز نہیں اس لیے کہ بنیادی طور پر یہ لوگ بے نیازی اور فقیروں کا لبادہ اوڑھے ہوئے مشرقی مزاج وتہذیب کے وہ اساتذہ ہیں جن کو اپنی انسانی، اخلاقی، مشرقی قدروں کا لحاظ ذاتی مفاد سے زیادہ عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضل امام ریٹائر ہو کر نہ جانے کیا سوچ کر، لکھنؤ جا کر اور خاص شیعوں کے محلّہ میں بس کر بھی لکھنوی وروایتی شیعہ نہیں بن سکے ہیں۔ نہ روحی نہ جوادی نہ ذاکری نہ چاکری۔ گوشہ میں بیٹھے سمٹے وہ آج بھی پروفیسر فضل امام ہی ہیں۔ اعظم گڑھ، گورکھپور، الہ آباد والے فضل امام۔ محمود الٰہی کے شاگرد فضل امام، ترقی پسند نظریہ سے منسلک فضل امام، حق گو حق پرست فضل امام، یہ فضل امام ہے یا کرپارام کی ہے کہا نہیں جا سکتا...... میرے لیے آج بھی وہ بڑے بھائی ہیں۔ ترقی پسند ادیب ہیں۔ ایک عمدہ مقرر ومفکر۔ بس اس پر زندگی ختم اور اسی پر مضمون بھی ختم۔

طوطیِ ہند خداداد خاں مونس

ڈاکٹر فضل امام رضوی

(میری یادوں کے آئینے میں)

وقت جب ماضی میں تبدیل ہوتا ہے تو برسوں کے واقعات بھی کل کی بات محسوس ہوتے ہیں یہ دبے پاؤں گذرتا ہے مگر اتنی تیزی سے گویا صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہو گیا۔ حال میں اس کی یادیں تلخ ہوں تو بھی کھٹی میٹھی لگتی ہیں بلکہ بسا اوقات تو یہ زندگی کے ہر نشیب و فراز کا سہارا بن کر مستقبل کے سجانے اور سنوارنے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ میں یادِ ماضی کے عذاب ہونے کا قائل نہیں کہ اللہ میاں سے اپنا حافظہ چھن جانے کی دعا کروں۔ اس کے برعکس شکر ادا کرتا ہوں کہ قرآن ماضی مجھے حفظ ہے اور میرا حافظہ اس کا محافظ ہے۔ ہر لمحہ اس کا ورد جاری رہتا ہے۔

میری یادوں کے آئینے میں جو عکس نمایاں ہیں ان میں ایک عکس ڈاکٹر فضل امام صاحب رضوی کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرے کئی رشتے ہیں۔ سب سے بڑا رشتہ یہ کہ وہ میرے استاذ ہیں۔ پھر وہ ایک مخلص دوست ایک مربی ایک ہمدرد اور باہمی روابط کے پاسدار ہیں۔ اردو دنیا میں فضل امام ایک معتبر اور مستند مورخ، محقق اور ناقد کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ وہ شعر کم کہتے ہیں مگر جب کہتے ہیں

تو ان کی باکمالی کا اعتراف باکمالوں کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ بقول ان کے مفاعلات فعولن ہی شاعری تو نہیں'' مجھے جے پور اور دیگر مقامات پر ان کے ساتھ طرحی مشاعروں میں بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام صاحب جب یاد آتے ہیں تو ذہن اس عقدے کا حل تلاش کرنے کی سعی لاحصل کرنے لگتا ہے کہ جب اقبالؔ نے خدمت استاد کی عوض ہدیۂ دل پیش کرنے کی خواہش کو اُجاگر کیا تو شفقت استاد کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ یہ جذبہ محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کے اظہار کے لئے الفاظ ناکافی ہیں۔ فضل امام صاحب کی ہمہ جہت شخصیت میں بھی ایک ایسے ہی شفیق استاد کی عظمتیں پنہاں ہیں۔

فضل امام صاحب سے میرے تعلقات کی عمر بیالیس سال کی ہے۔ ان کے ساتھ وقت کم گذرا مگر جو تعلق خاطر پیدا ہو گیا وہ آج تک نہیں مٹ سکا اور یقین ہے کہ آئندہ بھی بدستور قائم رہے گا۔ عجیب بات ہے کہ مجھے ان سے براہ راست تعلیم حاصل کرنے کا موقع صرف ایک ٹرم (Term) کے لئے ملا۔ مگر یہی مدت زندگی بھر کے لئے ایک پاکیزہ اور محترم رشتہ استوار کر گئی۔

ابتدائی دور میں کالج کی سطح پر راجستھان میں جن اساتذہ کی خدمات نمایاں ہیں ان میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اور ڈاکٹر محمد علی زیدی کے نام سرفہرست ہیں۔ عثمانی صاحب نے درس وتدریس کے علاوہ بھی اردو کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ کل ہند سطح کے ادبی سیمینار سمپوزیم اور دوسرے جلسوں کے انعقاد میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ آج بھی پیرانہ سالی کے باوجود موصوف پی ایچ ڈی کے متعدد طلبا کی رہنمائی کے لئے ہمہ وقت مصروف ہیں۔ وہ پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر زیدی صاحب کو خدا صحت کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے

راجستھان کے قدیم ترین اردو کے استاد ہیں۔ اردو کے سب سے زیادہ شاگرد اس صوبے میں موصوف ہی کے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا بھی ہمیشہ اعتراف کیا جائے گا۔ وہ راجستھان اردو اکادمی کے چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔

راجستھان یونیورسٹی جے پور میں ایم اے اردو کی تعلیم ہزار کوشش کے بعد ۱۹۷۳ء میں شروع ہوئی۔ ابتدائی دور بے حد کس مپرسی کا تھا۔ کتابیں دستیاب نہیں تھی اساتذہ کا فقدان تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے جو مہارانیہ کالج میں اردو درس و تدریس سے وابستہ تھے انتہائی نامساعد حالات میں تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس خاکسار نے یہ ذمہ لیا کہ کورس کے مطابق غزلیات قصائد وغیرہ جمع کر کے صفحہ کی آدھی چوڑائی پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر روزانہ اتنی تعداد میں سائیکلو اسٹائل کرانے شروع کئے کہ روز سب طلبا میں تقسیم ہو جائیں اور اتنی فاضل تعداد حفظ ماتقدم کے طور پر آئندہ سال آنے والے طلبا کے لئے محفوظ رکھ لی جائے۔ صفحہ کا آدھا حصہ اس لئے خالی رکھا جاتا تھا کہ طلبا اپنی یادداشت نوٹ کر سکیں۔ بہر حال اپنے ساتھیوں کی مدد سے یہ کام چلتا رہا اور بعد میں مسکین بک ڈپو نے ہمارے کورس کے مطابق کتابیں بھی شائع کر دیں۔

اس نازک وقت میں ڈاکٹر فضل امام صاحب نے بہ حیثیت لیکچرر شعبۂ اردو میں قدم رکھا تو عالم یہی تھا کہ ؎

زیارت کو نگاہیں منتظر ہیں
قدم بوسی کو راہیں منتظر ہیں

ڈاکٹر زیدی کے ساتھ سبھی طلبا نے خوش آمدید کہا۔ ان طلبا میں بیشتر سنجیدہ ذہن اور پختہ عمر کے تھے جنہوں نے کورس میں داخلہ ہی اس نیت سے لیا تھا کہ شرائط تعداد پوری ہو جائے اور ایم۔ اے اردو کی تعلیم کسی نہ کسی طرح شروع ہو جائے۔

فضل امام صاحب کیا آئے ہمیں اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ زیدی صاحب کے ہاتھ مضبوط ہوگئے اور شعبۂ اردو یونیورسٹی پر چھانے لگا۔ مجھے یاد ہے جب تک میں وہاں رہا کسی طالب علم نے کوئی لکچر نہیں چھوڑا۔ کورس کے مطابق تو تعلیم ہوتی ہی تھی مگر اس سے آگے بڑھ کر مختلف موضوعات پر فضل امام صاحب سے جب بھی گفتگو کی جاتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ اسی کے لئے تیاری کر کے آئے ہوں۔ وہ کلاس میں ایک استاد ہوا کرتے تھے مگر کلاس کے باہر ایک بہترین دوست اور ایک مخلص مشیر کی حیثیت سے ملتے تھے۔ میں چند ماہ ہی تعلیم جاری رکھ سکا مگر یہ عرصہ تمام عرصۂ حیات پر غالب ہے۔

۷ار دسمبر ۱۹۷۳ء کو جب میں یونیورسٹی گیا ہوا تھا میرے والد کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ جب گھر لوٹا تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ بہر حال جو کچھ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے وہ سب کچھ ہوا۔ یہاں یہ واقعہ درج کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ یہ خبر آنا فانا میں ڈاکٹر فضل امام صاحب تک پہنچ گئی۔ وہ فوراً تشریف لے آئے اور مجھے اس طرح سنبھالا جیسے گرتی ہوئی دیوار کو تھام لیا ہو۔ اس دن کے بعد میں یونیورسٹی نہیں گیا مگر فضل امام صاحب سے تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استوار ہو گیا۔ وہ جب تک جے پور میں رہے والہانہ تعلق بنا رہا۔ بہت سے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں ان کے ساتھ شرکت ہوئی۔

۱۹۷۹ء میں راجستھان اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ میں اس وقت راجستھان کی ایڈمنسٹریٹیو سروسز (RAS) سے متعلق تھا وہاں سے حکومت نے ڈیپوٹیشن پر مجھے اس کا اولین سکریٹری مقرر کر کے بھیجا۔ میں نے اپنے گھر میں اس کے پہلا دفتر قائم کیا اور تن تنہا کام شروع کیا اس وقت جن مخلصین نے ہمت افزائی کی اور عملی تعاون سے نوازا، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر فضل امام صاحب کا ہے۔ انہوں نے

راجستھان سے باہر کی ادبی دنیا میں ایسے حضرات سے متعارف کرایا جو ابتدائی مراحل کو حل کرانے میں بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوئے۔

یونیورسٹی کا دائرہ محدود تھا مگر بڑی تیزی سے فضل امام صاحب اس سے باہر بھی اہل علم وادب میں اپنی فکری اور فنی صلاحیتوں کے سبب ہر دلعزیز ہو گئے۔ ان کی تقریر اور تحریر کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ وہ جب یہاں آئے اس وقت جے پور میں ڈاکٹر عثمانی اور ڈاکٹر زیدی کے علاوہ کوئی صاحب تصنیف و تالیف نہیں تھا، رفتہ رفتہ حالات بہتر ہونے لگے اہل قلم کی خاصی تعداد ہوگئی۔ اکادمی کے تعاون سے نثر و نظم کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سادات جے پور کے یہاں عشرۂ محرم کی مجالس بھی اہل علم کی ہجرت کے سبب ادھوری محسوس ہونے لگی تھیں۔ عزاخانوں کے منبر خاموش تھے۔ بس روایات کی پاسداری باقی تھی البتہ باہر سے ذاکرین آتے تھے تو روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے کا سامان فراہم ہو جاتا تھا۔ فضل امام صاحب کی شرکت سے یہ مجالس دوبارہ اسی طرح برپا ہونے لگیں جس طرح کبھی ہوا کرتی تھیں۔ ہر فرقہ اور مذہب کے ماننے والوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے میں نے کچھ خاص باتیں ایسی بھی محسوس کیں جنہیں عام طور پر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے میرے غریب خانے کے قریب ہی حکیم افتخار علی خاں صاحب مرحوم کے امام باڑے میں مجلس ہو رہی تھی فضل امام صاحب بڑے موثر اور رواں انداز میں بیانِ شہادت فرما رہے تھے۔ اچانک عصر کی اذان کی آواز کانوں میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب منبر سے نیچے اُتر آئے اور اذان کے احترام میں خاموش بیٹھ گئے۔ جب اذان ختم ہوگئی تو ڈاکٹر صاحب نے اعلان فرمایا کہ نماز مقدم ہے تیاری کی

جائے مجلس نماز کے بعد جاری رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ احتیاط کم ہی دیکھی گئی ہے۔ مگر فضل امام صاحب کی اس ادا کو جے پور والے آج تک بھلا نہیں پائے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۶ء تک راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی سے وابستہ رہے۔ یہیں وہ ریڈر کے عہدے پر فائز ہوئے اور صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے بعد ازاں وہ الٰہ آباد چلے گئے جہاں وہ پروفیسر وصدر شعبہ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ حکومت اتر پردیش نے انہیں یو پی سیکنڈری ایجوکیشن سروس کمیشن کا چیر مین بھی نامزد کیا۔

جے پور میں قیام کے دوران ڈاکٹر فضل امام صاحب کی چھ تصانیف شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ ۱۹۹۲ء میں خوشتر مکرانوی صاحب نے مختلف ادبا کے مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ 'ڈاکٹر فضل امام ایک مطالعہ' مرتب کر کے شائع کرایا جس سے ظاہر ہے کہ اہل راجستھان ڈاکٹر صاحب کو ترک سکونت کے بعد بھی بھلا نہ پائے۔

راجستھان میں اردو میں پی، ایچ ڈی کا باضابطہ سلسلہ ۱۹۸۲ء سے شروع ہوا تو فضل امام صاحب کی نگرانی میں ۱۹۸۶ء تک کل سات طلبا کو یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ان میں سے چار مقالے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ فضل امام صاحب کا اس صوبہ پر یہ احسان ہے کہ یہاں سے متعلق ادبی تحقیق کی جو راہیں ڈاکٹر عثمانی نے کھولی تھیں انہیں ڈاکٹر صاحب نے مزید کشادہ کیا چنانچہ ان کی نگرانی میں ''مولوی سلیم الدین تسلیم۔ حیات اور کارنامے'' ''ریاست ٹونک میں اردو شعر و ادب'' اور ''تاریخ گوئی'' اور راجستھان کا مایۂ ناز تاریخ گو بصیر ٹونکی جیسے مقالہ لکھے گئے۔

۲۰۱۲ء میں میرا ہدیہ سلام و مناقب ''بخشش کی راہوں میں'' شائع ہوا تو ڈاکٹر فضل امام صاحب نے اپنے رشحات قلم سے نواز کر اسے سند اعتبار بخشی جس کے

لئے میں ہمیشہ ممنون احسان رہوں گا۔ یہ ان جیسے مخلص کی دعاؤں ہی کا فیض تھا کہ اس مجموعے کا اجرا نجف اشرف میں مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسی درِ اقدس پر ہوا جس کی تصویر کتاب کی جلد پر نمایاں تھی۔

دعا ہے کہ خدا ڈاکٹر صاحب کے زورِ قلم اور زورِ بیان کو مزید توانائی دے اور وہ صحت کے ساتھ خدمت دین اور خدمت ادب میں مصروف رہیں۔

اب بھی ممکن ہے کہ روشن نئی شمعیں ہو جائیں
جل رہے ہیں ابھی کچھ اگلی بہاروں کے چراغ

خداداد خاں مونس
سابق ناظم درگاہ خواجہ صاحبؒ اجمیر
وسابق ڈائریکٹر مولانا آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک۔

ڈاکٹر غلام حسین
صدر شعبۂ اردو، وکرم یونیورسٹی
اجین

بے مثال شاگرد باکمال استاذ

پروفیسر محمود الہی قدس سرہٗ کے قدوم میمنت لزوم سے شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی، مشرقی یوپی کا منارۂ نور ثابت ہوا جس کی روشنی دور دور تک پھیلی، معتدد بہ متعلم علم کی دولت سے مستفیض ہوئے۔ پروفیسر محمد حسن صاحب نے کبھی لائق و فائق شاگرد پروفیسر محمود الہی صاحب کی غایت خدمات کے پیش نظر اسے دبستان الہی سے تعبیر کیا تھا جو آج حرف بہ حرف حقیقت بن گئی ہے، مشہور زمانہ عالم، دانشور، مدبر، ادیب یگانۂ روزگار خطیب، معتبر ناقد اور مشفق استاذ پروفیسر فضل امام رضوی کا تعلق خاطر اسی دبستان مذکور سے ہے جس پر اہل دبستان کو بجا طور پر فخر و مباہات ہے۔ موصوف عملی طور پر اس شعر کے مصداق ہیں ؂

اگر استاد کا حکم بجا لاؤ گے
تو خادم سے مخدوم بن جاؤ گے

مشرقی تہذیب میں استاذی اور شاگردی کی بڑی برومند اور متبرک روایت رہی ہے۔ امیر خسروؔ کی ارادت مندی کا یہ عالم تھا ؂

خلق می گوید کہ خسروؔ بت پرستی می کند
آری آری می کنم باخلق ما را کار نیست

اسی تہذیب کے پروردہ اور پرداختہ بے مثال اور باکمال استاذ پروفیسر رضوی صاحب ہیں۔ دورحاضر میں آپ نے استاذ کے احترام وادب کی پاسداری اور رواداری میں نادر نمونہ پیش کیا ہے اور استاذ بھی ایسے کہ شاگرد اور استاذ کے درمیان تفاوت اور تجاوز کا امتیاز اٹھا دیا تھا، اگر کبھی دونوں حضرات ایک ساتھ تشریف فرما ہوتے تو کسی اجنبی کو استاذ اور شاگرد میں تمیز کرنا کاردارد تھا۔ راقم الحروف نے جب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس وقت رضوی صاحب کا تقرر راجستھان یونیورسٹی میں ہو گیا تھا لیکن شعبہ میں ان کا بڑا چرچا تھا۔ ہر کوئی آپ کا گرویدہ تھا۔ آفس میں رام بلاس اکثر ذکر خیر کرتے سبھی اساتذہ آپ کی علمیت اور حسن سلوک کے قائل تھے۔ پروفیسر احمر لاری صاحب، ڈاکٹر اختر بستوی صاحب اور ڈاکٹر افغان اللہ خاں صاحب انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یونیورسٹی میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ ادبی حلقوں نے انھیں کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس کشش سے وہ اکثر گورکھپور آتے رہے اور جب وہ الہ آباد یونیورسٹی پہنچے تو گورکھپور آنے جانے کا سلسلہ اور دراز ہوا۔ ان سب میں اپنے استاذ سے شرف ملاقات کی کارفرمائی ہوا کرتی تھی۔ قیام استاذ ہی کے یہاں ہوتا۔ طلباء اور اساتذہ ان سے مل کر باغ باغ ہوتے۔ مشفقانہ رویہ کی وجہ سے وہ اپنے خوردوں میں محترم تھے۔ جب شام میں وہ ریلوے اسٹیشن یا گول گھر کی طرف نکلتے تو ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا۔ یہ موقع مجھے بھی ملتا۔ ٹہلتے وقت وہ بڑی فکر انگیز گفتگو کرتے تھے اور زبان وادب کے رموز ونکات پر روشنی ڈالتے اور قواعد کی اہمیت کو بتلاتے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا کہ اس کی ضرورت نہ صرف ابتدائی تعلیم میں ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم میں بھی ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں تو اس سے یکسر صرف نظر کیا جاتا ہے۔ رضوی صاحب صرف ونحو کے ماہر ہیں۔ کلمہ، جملہ، اسم، فعل، حرف کے اقسام ان کے نوک زباں رہے۔ ایک بار

NCERT دہلی کی جانب سے مجھے ایک ورکشاپ میں شرکت کا اتفاق ہوا بڑے بڑے نامور پروفیسر وہاں تشریف فرما تھے۔ موضوع قواعد زیر بحث تھے۔ بات جب مرجع کی آئی تو ایک صاحب سر کہ جبیں ہوگئے۔ اس وقت رضوی صاحب مجھے بہت یاد آئے اور پندرہ سال پہلے راستہ چلتے جو سبق پڑھایا تھا وہ میرے کام آیا۔ قواعد علم بیان و بدیع پر رضوی صاحب کی گرفت مضبوط ہے اور یہ وہ فن ہے جو دوران تدریس قدم قدم پر اساتذہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ آپ کا قوت حافظہ اور انداز فہمائش نرالا ہے۔ ناکندۂ تراش کو ترغیب وتشویق سے ہیرا بنانا کوئی ان سے سیکھے۔ صحت زبان اور قرأت کی اہمیت سے وہ آشنا ہیں۔ وہ فقط لکچر پر اکتفا نہیں کرتے۔

گورکھپور یونیورسٹی کے موجودہ صدر شعبۂ ڈاکٹر رضی الرحمن صاحب، رضوی صاحب کے مداحوں میں ہیں۔ آپ سے کسب فیض کے لیے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھتے رہتے ہیں اور رضوی صاحب انھیں کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے..... ایک بار گورکھپور یونیورسٹی میں قومی سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں ملک بھر سے اردو ادب کی نامور ہستیوں نے شرکت کی۔ وہ ایسا وقت تھا کہ پروفیسر محمود الہٰی صاحب کو سبکدوش ہوئے عرصہ گذر گیا تھا۔ پروفیسر افغان اللہ خان اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ پروفیسر احمر لاری صاحب بھی سبکدوش ہوگئے تھے اور ان پر ناطاقتی کا عالم تھا۔ اس وقت سیمینار کو کامیاب بنانے میں پروفیسر رضوی صاحب اور پروفیسر عبدالحق صاحب نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس وقت مشاعرہ کا اہتمام اسلامیہ کالج میں کیا گیا جس کی صدارت رضوی صاحب نے کی، اپنی بصیرت افروز صدارتی تقریر کے لیے جب وہ کھڑے ہوئے تو ایسا لگا۔

نکلا دہاڑتا ہوا ضیغم کچھار سے

آپ کا لفظ لفظ دانائی اور بینائی سے معمور تھا۔ مقفٰی اور مسجع عبارت ایسی کہ

اس پر فسانہ عجائب کا گمان ہوتا۔ بندش الفاظ میں دلآویزی ایسی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ وہ تقریر کیا تھی بس اتنا سمجھ لیئے کہ تحت میں جیسے کوئی شعر پڑھ رہا ہے۔ زور جس میں میر انیس اور جوش ملیح آبادی کی روح سمٹ آئی ہے۔ سامعین پر یک لخت سکتہ طاری تھا۔ صدارتی تقریر کے خاتمہ پر چاروں طرف صدائے تحسین بلند ہوئی۔ لوگوں سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ صدارتی تقریر اسے کہتے ہیں اس کے شاہد ہمارے ہمدم دیرینہ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور ڈاکٹر اکبر علی ہیں۔

قیام کا انتظام یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ کنہیں وجوہ کی بنا پر میرے نام کمرہ الاٹ نہیں ہوا تو رضوی صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے مجھے اپنے کمرہ میں ٹھہرا لیا۔ کمرہ میں ایک ہی تخت تھا مگر آپ کی شفقت نے اس میں بھی وسعت پیدا کر دی۔ میں احتراماً خاموش تھا اور کچھ ہچکچاہٹ تھی مگر آپ کے رویہ اور انسانیت سے ایسا لگا جیسا کہ ایک مفکر نے کہا ہے کہ ایک کمبل کے اندر دو فقیر سو سکتے ہیں مگر ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ ان دنوں شدید گرمی تھی بجلی ندارد اور مچھروں کی یلغار الاماں، الحفیظ لیکن رضوی صاحب صابر اور شاکر بنے رہے ہائے توبہ نہیں مچایا بلکہ صبر و ضبط سے مچھروں کو بھگانے کی تدبیر کرتے رہے۔ رسالے اور کتاب سے پنکھے کا کام لیتے رہے۔ ایسی صورت میں نیند کہاں بس میں رضوی صاحب کے صبر و تحمل کو دیکھ کر عش عش کرتا رہا۔ اور یہ مقام حیرت تھا کہ اس قدر صبر و رضا کا مادہ آپ میں کہاں سے آ گیا تھا؟ یہ کہیں واقعۂ کربلا کا فیض تو نہیں! سچ ہے کہ زندگی کے اعتدال اور اعتماد میں سانحۂ کربلا سبق آموز ہے۔......رضوی صاحب فطرتاً انتہائی منکسر المزاج ہیں۔ ان کے عزیز و اقارب دوست اور شاگرد سب ان کے حسن سلوک کے گرویدہ ہیں۔ وہ نہ تو کسی کے شاکی ہیں اور نہ ہاجی! یہی ان کی خیر و عافیت اور طمانیت کا راز ہے۔

تدریس اور تحریر کے باب میں رضوی صاحب کی خدمات قابل ذکر ہی نہیں بلکہ قابل فخر ہیں۔ گورکھپور یونیورسٹی سے انھوں نے ڈاکٹریٹ اور ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں حاصل کیں۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق وشوق ان میں بدرجہ اتم ہے۔ یہی ان کی زندگی کا وظیفہ حیات اور شہرت دوام کی ضمانت ہے۔ تحقیقی مقالے، ترتیب وتدوین اور انتخاب کے توسل سے اردو کے اہم شعراء وادباء کو خوب سے خوب تر انداز میں متعارف کرایا۔ درجنوں ادبی مقالے موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جس کی ارباب ادب نے بڑی پذیرائی کی ہے، ابھی یہ سلسلہ جاری ہے، ادب شناسی میں انھیں مہارت حاصل ہے، زبان وبیان پر عبور اور تاریخ کا انھیں بہترین شعور ہے۔ اس لیے ان کے محاکے معقول اور معتبر ہوتے ہیں۔ کلام حسرتؔ کا انتخاب اور مقدمہ معرکتہ الآرا ہے۔ اردو ادب میں حسرتؔ کا مقام ومرتبہ اس انداز میں متعین کرتے ہیں:۔

> ''حسرتؔ کی زبان اور روزمرہ اور محاورے لکھنوی ہیں مگر فارسی کی دلکش تراکیب کا استعمال دبستان مومنؔ کی چھاپ لئے ہوئے ہے۔ اس اعتبار سے ان کی زبان بھی خالص نہیں ہے بلکہ اس میں دہلوی اور خصوصیت سے دبستان مومنؔ کے واضح لکھنوی اثرات نمایاں ہیں مضامین میں اثر آفرینی، رنگینی، دل ربائی، سادگی اور برجستگی دہلویت کا اعلان کرتی ہے۔''
>
> (انتخاب کلام حسرت۔ ص۔ ۷)

رضوی صاحب ایک مایۂ ناز خطیب ہیں۔ وہ اس فن کے مالہ وماعلیہ سے کما حقہ واقف ہیں۔ وہ فن خطابت کی تشریح وتوضیح موثر انداز میں کرتے ہیں:

''دراصل خطابت بڑا نازک اور مشکل فن ہے۔ یہ صلح کی طرف بھی مائل کرسکتی ہے اور آمادۂ پیکار بھی کرسکتی ہے۔ یہ شاخ گل بھی ہے اور شمشیر بے نیام بھی۔ خطابت مردہ قوموں کو بیدار کرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ دلوں میں ولولہ اور حوصلہ بھی پیدا کرسکتی ہے۔ مصائب، اور شدائد میں تسلی، تشفی کا موثر ذریعہ بھی بنتی ہے، صبر وضبط و استقلال درس بھی دیتی ہے اور سناں شمشیر تیر تفنگ اٹھانے کا حوصلہ بھی بخشتی ہے؟۔''

(انتخاب کلام جوشؔ۔ص۔۲۱)

پروفیسر رضوی صاحب ابھی مصروف عمل ہیں۔ آج بھی اپنی تحریر اور تقاریر سے کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے اسلوب کو میر انیسؔ کی فصاحت اور بلاغت کی صلابت سے صیقل کرتے ہیں نیز جوشؔ کی خطابت اور گھن گرج کی طلاقت سے آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں جس میں فارسی و عربی زبان کی شیرینی اور معنی آفرینی موجود ہے۔ جملہ در جملہ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے درادکا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے جوہر علمی سے اردو زبان وادب کی آب یاری میں منہمک ہیں سماجی خدمات میں حق گوئی و بے باکی کے علم بردار ہیں۔ گویا ہر اعتبار سے سرفراز اور پُر وقار ہیں جن کا سایۂ عاطفت نئی نسل کو درکار ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین

ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن
صدر شعبۂ اُردو
گورکھپور یونیورسٹی

پروفیسر فضل امام رضوی کی تنقیدی بصیرت

زبان وادب کا مطالعہ سنجیدگی کا متقاضی ہے۔ مذہبی صحائف کے بعد ادبی صحائف کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی ذہن وفکر کے ارتقائی سفر کا اسے ایک بہترین، عمدہ اور قریب الحقیقت ماخذ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا لیکن ادب کی قدر و قیمت افادیت بغیر تنقید کے ممکن نہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ تنقید سے مراد تعمیری تنقید سے ہے، تنقیص سے نہیں۔ تنقیص سے ادب وفن کو نقصان ہی پہنچتا ہے۔ صحت مند اعتراض کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔

اردو میں تنقیدی کے دو دھارے عموماً پائے جاتے ہیں۔ غالب رجحان تعمیری تنقید کا ہے لیکن کہیں کہیں عصبیت کے پردے سے تنقیصی تنقید جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی کی تنقید تعمیری تنقید کے ذیل میں آتی ہے۔ آپ نے حالی وشبلی، امداد امام اثر اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے تنقیدی رویوں اور رہنما اصول کو اپنی تنقید کا محور ومرکز بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ با معنی گفتگو کے قائل ہیں۔ محض الفاظ واصطلاحات سے کھیلنا آپ کا شیوہ نہیں۔ آپ نہ تو مغرب سے بے

زار ہیں اور نہ ہی مشرق سے حذر کرنے کے قائل ہیں بقول اقبال ۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ بخارا نہ سمر قند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

آپ ادب کی تنقید کے لئے ہر دو جہاں کے صالح عناصر سے کام لیتے ہیں اور بعدازاں تنقید و تجزیے کے مرحلے سے گذرتے ہیں۔

پروفیسر فضل امام یوں تو ایک کامیاب استاد بھی رہے ہیں اور آپ نے انگنت طلباء کی ذہنی تربیت بھی کی ہے۔آپ کی شفقت، محبت اور خلوص کے سب قائل ہیں۔آپ کے اندر پروفیسرانہ کروفر دکھائی نہیں دیتا۔سادگی اور صاف گوئی آپ کے مزاج کا خاصہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ ذہن کو نہیں بلکہ دل کو متاثر کرتے ہیں۔آپ کے شاگردان اور رفقاء اسی لئے بے حد عزت واحترام سے آپ کا نام لیتے ہیں۔آپ نے کبھی صلہ کی پروا نہیں کی بلکہ ہمیشہ درویشانہ اور قلندرانہ انداز سے زندگی گزاری ہے۔ آپ نے جس سے بھی تعلق یا رشتہ قائم کیا انتہائی وضعداری سے اُسے نبھایا ہے۔آپ کا کریمانہ انداز آپ کی شخصیت کا جوہر خاص ہے۔

ادب کی تشریح وتعبیر میں آپ کی شخصیت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔آپ بے جا طعن وتشنیع سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنی بات نہایت مدلل انداز میں تمام تر حوالوں کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔آپ کی تنقید کا ایک وصف خاص تحقیقی اساس پر مبنی ہونا ہے۔ عام طور سے یہ بات اردو کے ناقدین میں کم نظر آتی ہے۔

آپ نے زبان وادب کا مطالعہ کھلے ذہن سے کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ

کی تحریروں میں ایک طرح کی تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔ آپ بہت رواں اور مدلل نثر لکھتے ہیں۔ پیچیدہ اور دوراز کار مفہوم پر مبنی گفتگو کے آپ قائل نہیں ہیں۔

آپ کے یہاں مضامین کے عناوین میں تنوع پایا جاتا ہے۔ محض شاعری یا نثر تک آپ اپنے مطالعہ کو محدود نہیں رکھتے بلکہ ہر دو پیرائے اظہار پر یکساں نگاہ ڈالتے ہیں اور تنقید کے دائرے میں انھیں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کے یہاں تنقید تفہیم قدر اور تعین قدر کا نام ہے۔ آپ نگارشات کی باریکیوں خواہ وہ فکری ہوں یا فنی کمال قدرت سے نگاہ ڈالتے ہیں اور بڑی حد تک موضوع کا حق ادا کرتے ہیں۔ آپ کے مضامین پڑھ کر سوچ وفکر کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

شمالی ہند کے اساتذہ وطلباء کے لئے دکنی ادب بہ شمول دکنی مراثی کی تدریس ایک مسئلہ ہے۔ ہم میں سے بیشتر دکنی ادب کی زبان، تلفظ اور تہذیبی وثقافتی عناصر سے کما حقہ واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا دکنی متون کو تمام تر فکری وفنی جہتوں سے پڑھنا اور پڑھانا مشکل امر ہے۔ اس پریشانی سے پروفیسر فضل امام رضوی بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا آپ نے اس اہم موضوع پر اپنے ایک تحقیقی مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور دکنی مراثی سے متعلق جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ قابل قدر ہیں:

> ''دکنی مراثی گہرے سماجی شعور کے ترجمان ہیں لہٰذا ان مراثی کی درس وتدریس اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب کہ دکن کے سماجیاتی پہلوؤں کا مطالعہ کیا جائے۔ لیکن یہ مطالعہ اور مشاہدہ صرف ظاہری نہیں ہو بلکہ اس کے اندرونی کوائف اور محرکات سے باخبری ازبس ضروری ہے۔''

(دکنی مراثی کی تدریس کے مسائل از مشرقی انتقادیات۔ اصول ونظریات، ص ۴۴)

آپ کا ایک عمدہ اور تحقیقی مضمون ''سوز خوانی'' کی روایت اور آداب پر ہے۔ یہ مذکورہ موضوع پر انتہائی جامع اور پراز معلومات مضمون ہے۔ آپ نے نہ صرف سوز کی معنوی جہتوں پر لغات کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے بلکہ ''سوز خوان'' اور ''سوز خوانی'' پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک کتاب کا متقاضی ہے لیکن پروفیسر فضل امام رضوی نے اس دریا کو ایک مضمون نما کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس سے ایک تو ان کی اس موضوع پر دست رس کا پتہ چلتا ہے دوسرے یہ کہ اختصار سے کسی موضوع کے انتہائی وسیع مواد کو ایک مضمون کی شکل میں کس طرح پیش کیا جاتا ہے، کا علم ہوتا ہے۔ اس مضمون کی ایک خاص بات یہ ہے کہ سوز خواں حضرات نے سوز کی پیش کش میں کن کن راگ راگنیوں کا خاص طور پر استعمال کیا ہے اس کی تفصیل مع مثال آپ نے پیش کی ہے۔ اس سے یہ انداز ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف موسیقی کا علم رکھتے ہیں بلکہ موسیقی نے کس حد تک اردو کے دامن کو قوس قزح بنا دیا ہے اس پر آپ کی نگاہ گہری ہے۔ مثلاً

گھیرے ہوئے اکبر کو حرم دیکھتے ہیں
سینے پہ رکھے ہاتھ ہیں دم دیکھتے ہیں
ہے نزع میں دم توڑ رہا ہے بیٹا
اور پاس سے سلطانِ اُمم دیکھتے ہیں

(راگ پیلو)

اس فن کے عناصر ترکیبی اور جاودانی حیات بخشنے والے اجزاء کو آپ نے یوں نمایاں کیا ہے:

''سوز خوانی میں سوز کی ضرورت رہی ہے۔ ساز سے اس

کا تعلق نہیں تھا۔ ہاں دل سے اس کے تار جھنجنا اٹھتے ہیں۔ سوز خواں ہمیشہ سے پابند سوز و غم رہے ہیں۔ اس لئے اس کے نالے کسی ''لے'' کے پابند نہیں رہے۔ آج بھی یہ فن زندہ ہے اور عزائے حسین کا دیباچہ بنا ہوا ہے اور آئندہ بھی یہ غم حسین کا اعلانیہ بنا رہے گا۔''

(سوز خوانی - روایت اور آداب از مشرقی انتقادیات اصول و نظریات، صفحہ ۲۵)

مولانا شبلی نعمانی نے موازنہ کے ذریعہ انیسؔ کے شعری امتیازات کو جس انداز سے پیش کیا اور دبیرؔ کو انیسؔ کے مقابلے میں ''ثقالت پسند'' قرار دیا اس سے نہ صرف موازنے کی ایک غلط روایت قائم ہوئی بلکہ مولانا شبلی نعمانی کے نقش قدم پر چل کر دبیرؔ کو نیچا دکھانے کی ایک قبیح رسم کی شروعات بھی ہوئی۔ موازنہ کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن یہ مبارزت آرائی میں بدل جائے تو نتائج ہمیشہ غلط نکلتے ہیں۔ دبیرؔ کے ساتھ ناانصافی اسی مبارزت آرائی کے سبب ہوئی۔ دبیرؔ کے ساتھ ہونے والے اس ناانصافی اور تنقیصی رویئے کو پروفیسر فضل امام رضوی ادبی مطالعے کے لئے نیک فال نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں تنقید پارٹی بندی اور تحسین بیجا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تعین قدر اور ایک منصفانہ عمل ہے اور ناقد کو اس کا پاس و خیال رکھنا چاہئے۔ مرزا دبیرؔ پر کئے گئے کام پر آپ کا مضمون اسی جذبہ کا غماز ہے۔ دبیریاتی مطالعہ کے یک رُخے پن پر آپ کا یہ اعتراض بجا ہے کہ:

''چند مفروضہ امتیازات کے چوکھٹوں میں دبیرؔ کے شاعرانہ اکتسابات کا احاطہ کرنے والے غالباً اردو شعریات کو انتہائی محدود و مسدود تصور کرتے ہیں حالانکہ شعر و ادب کا غائر مطالعہ عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ دل سوزی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔''

آگے انھوں نے اپنے منصفانہ موقف کی مزید وضاحت کی ہے:

''میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مرزا دبیر اور میر انیس کے فنی اکتسابات اور عملی و ادبی و شعری تجربات کا تجزیہ اصل اور بنیادی چیز ہے۔ موازنہ اور مقابلہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے مورخین اور ناقدین نے ''ثانوی'' حیثیت کو ہی شرف اولیت بخشا ہے جو انتہائی گمراہ کن ہے۔''

(عہد حاضر میں مرزا دبیر پر تحقیقی و تنقیدی..... از مشرقی انتقادیات، صفحہ ۵۵-۵۳)

اسی سلسلے کا ایک اچھوتا مضمون ''اردو مرثیوں میں نعت'' ہے۔ غالباً اس نوعیت کا مضمون اردو میں نہیں لکھا گیا یا یہ ہوسکتا ہے کہ میری کوتاہ نظری نے مجھے اس طرح کے مضامین کے مطالعے سے محروم رکھا۔ بہر حال یہ ایک قابل قدر مضمون ہے اور یہاں ہمیں مرثیوں میں نعت کی صورت اور جہت کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ پروفیسر فضل امام اکثر و بیشتر موضوع کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین محض تنقیدی اشارے یا اقتباسات مسلسل نہیں ہوتے بلکہ تنقید کے ساتھ ساتھ آپ تحقیق کا بھی حق ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ قاری کے لئے ہر ممکن تسلی و تشفی کا سامان فراہم کرتے ہیں اور آپ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ آپ مقالہ کا حق ادا کردیں اور اس اعتبار سے آپ کامیاب ہیں۔

یہ مضمون اگر چہ اردو مرثیوں میں نعت کی روایت سے متعلق ہے لیکن آپ نے عربی اور فارسی وادبیات میں اس کی کیا روایت رہی اس پر بھی روشنی ڈالی ہے اور شمال و جنوب کے اردو ادب میں جو روایت رہی ہے اس پر سیر حاصل اور مدلل انداز میں گفتگو کی ہے۔ یہ ایک دریا ہے جو کوزہ میں بند ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ ہمیں اس میدان

میں مزید تحقیق کی دعوت دیتا ہے۔ آپ نے موضوع کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے بہت ہی بلیغ انداز میں مطالعہ اور تحقیق کی دعوت دی ہے آپ لکھتے ہیں کہ:

> "مرثیہ نگاروں نے لطیف و بلیغ اشاروں میں سیرت و جمال پیغمبر اسلام کو نظم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کے شعور میں قرآن مجید کی جلالت و عظمت، احادیث کی رفعت و حرمت، تاریخ اسلام، گراں قدر اور مقدس روایات کے بصیرت افروز اور دل کش نتائج ہیں جس میں شعریت اور ادبیت کا حسین امتزاج نگاہوں کو خیرہ اور عقل کو متحیر کر دیتا ہے۔ اسی لئے بعض ناواقف اور شعر و ادب کی طویل روایت سے بے خبر حضرات یہ فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ اردو مرثیہ نگاروں نے مدح سرور کائنات کو نظر انداز کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو مرثیہ نگاروں نے مدحتِ رسول کائناتؐ میں تطہیر مزاج اور تزکیہ نفس سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دیوانگی کو نہیں فرزانگی کو پیمانۂ عشق میں ڈھالا ہے۔ میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ نعتیہ مضامین کی تفہیم کے لئے جس خاص رچے بسے ادبی ذوق کے ساتھ تاریخ، تہذیب، تمدن حکمت اور گہری ثقافت کی جس علمی ژرف نگاہی کی ضرورت درکار ہے اس سے عام طور پر ہمارے معترضین عاری ہیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لینے میں یقین رکھتے ہیں۔" (صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

کلاسیکی اصناف سے قطع نظر آپ دیگر زبان و ادب سے واقفیت کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ آپ اردو زبان و ادب کے شناور تو ہیں ہی اس کے علاوہ انگریزی، ہندی اور سنسکرت ادبیات سے بھی واقف ہیں۔ آج جب کہ اردو کے اساتذہ اردو کا

واجبی علم بھی نہیں رکھتے آپ نے ان چار زبانوں کے ادب کو نہ صرف پڑھا ہے بلکہ ان پر آپ کی نظر گہری ہے۔ یہاں میں اس بات کا ذکر بھی کرتا چلوں کہ آپ اودھی اور بھوجپوری زبان و ادب کا بخوبی علم رکھتے ہیں اور ان زبانوں کے استعمال پر قادر بھی ہیں۔ مذکورہ زبانوں سے متعلق آپ کی واقفیت سے انداز ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعاتی کینوس کس قدر وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کوئی بات اگر کہتے ہیں تو وہ بڑی ذمہ داری سے کہتے ہیں۔

پروفیسر فضل امام کا مضمون ''سنسکرت میں ناول نگاری'' ان کے وسیع مطالعہ کا بین ثبوت ہے۔ یہ ایک مختصر سا مضمون ہے لیکن اس مضمون میں انھوں نے سنسکرت ناول کی روایت اور سمت و رفتار کا خاکہ ضرور پیش کر دیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

> ''آج کے دور میں جو بھی ناول سنسکرت میں لکھے جا رہے ہیں وہ قطعی طور پر قدیم ڈگر پر گامزن ہیں۔ ان کے نام اور کردار بھی مہابھارت سے مستعار معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے باوصف سنسکرت ناولوں میں قدیم تہذیب و معاشرت کا احیا زیادہ قرینے سے ہوا ہے یہی سنسکرت ناولوں کی بنیادی خصوصیت ہے۔'' (صفحہ ۱۲۴)

کوئی بھی زبان و ادب ترجمے اور دیگر زبانوں کے ادبیات کے ذکر و افکار سے متمول ہوتا ہے اس میں نیا خون اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ آج اردو کا دامن اگر سمٹا سمٹا نظر آتا ہے تو اس کی وجہ تراجم کی کمی اور دیگر زبانوں کے ادب سے عدم واقفیت ہی ہے۔ یہ مضمون دراصل اسی کی تلافی ہے لیکن جب یہ لکھا گیا تھا اس سے اب تک سنسکرت ادب بہت آگے نکل چکا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ پروفیسر فضل امام رضوی کی پیروی میں اس طرح کے مضامین تواتر سے لکھے جائیں۔

پروفیسر فضل امام کا اسی ذیل میں ایک اہم مضمون ''کبیر ایک مطالعہ'' ہے۔ کبیر داس اپنے دور کے انقلابی اور عوامی شاعر رہے ہیں۔لیکن اردو والوں نے کبیر سے ایک دوری بنائے رکھی ہے۔ اردو اشرافیہ کا یہ ایک ذہنی دیوالیہ پن ہے فضل امام صاحب کو اس بات کی شکایت ہے کہ اردو والوں نے کبیر کو اردو میں جگہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ کبیر پر دو ایک کتابوں کے علاوہ چند مضامین بمشکل فراہم ہوتے ہیں۔ جبکہ کبیر کا انداز بیان اور ان کی شاعری کے موضوعات دونوں توجہ طلب ہیں۔ اس مضمون میں پروفیسر فضل امام نے نہ صرف اردو ہندی میں کبیر پر لکھی کتابوں کا ذکر کیا ہے بلکہ کبیر کی شاعری اور ان کے فلسفۂ حیات و کائنات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون نہ صرف کبیر کو سمجھنے سمجھانے کی ایک عمدہ کوشش ہے بلکہ مطالعۂ کبیر کی دعوت بھی دیتا ہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ پروفیسر فضل امام کا مطالعہ انتہائی وسیع ہے۔آپ نہ صرف دوسری زبانوں کے ادب سے اپنی واقفیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں بلکہ کلاسیکی شعروادب سے اپنی گہری شناسائی کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جہاں آپ قدیم وجدید تناظر میں اصناف شعری کا مطالعہ کرتے ہیں وہاں شخصی مطالعے کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ میر، کبیر، چکبست، اقبال وغیرہ پر آپ کے پُر مغز مضامین دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ عصری ادب سے بھی گہری واقفیت کا آپ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے۔آپ نظریاتی طور پر ترقی پسند فکر کے قریب رہے ہیں لیکن اسیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فراق، کیفی، مجروح، سجاد ظہیر، جوش و احتشام پر خامہ فرسائی کی ہے اور ان پر تواتر سے لکھا ہے۔

پروفیسر فضل امام کے مضامین کا دائرہ عام طور سے اصناف شعری رہا ہے لیکن آپ نے نثری اصناف اور ان سے وابستہ شخصیات کو بھی مطالعے کے دائرے میں

لانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا آزاد، عبدالماجد دریا آبادی، پریم چند اور ممتاز مفتی پر آپ کے مضامین نثری مطالعے کے ذیل میں قابل قدر ہیں۔ آپ نے سنجیدہ علمی نثر پر جہاں اظہار خیال کیا ہے وہاں افسانوی ادب کو بھی میزان نقد پر تولنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مغربی تنقید سے آپ نے جہاں بحث کی ہے وہاں اردو تنقید کے نشیب وفراز کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح پروفیسر فضل امام رضوی کی تنقیدی کائنات قوس قزح ہے۔ آپ تنقید کو تکذیب وتذلیل کے لئے استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی سطحی مطالعہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ گول مول بات کرنے کے قائل بھی نہیں ہیں۔ آپ معتدل انداز میں موضوع کے دائرے میں رہ کر مقالہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کے مضامین صرف تنقید کے ذیل میں نہیں آتے بلکہ اس میں ایک محقق کی نگاہ بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ آپ ہمیشہ اپنے مضامین میں اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ قاری کو نئی روشنی سے روشناس کرایا جائے اور ڈھیر ساری کتابوں سے بے نیاز کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ جملہ حقائق کو جس طرح یک جا کر دیتے ہیں اس سے قاری کے اندر مطالعہ کی للک بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ آپ کے مطالعہ اور حوالوں کی روشنی میں مزید جانکاری کے لئے آمادہ نظر آتا ہے آپ کے مضامین کی یہ ایک بڑی خوبی ہے۔

آپ کی عبارت صاف ستھری اور زبان شگفتہ وشائستہ ہوتی ہے۔ معیار زبان کا جہاں آپ پاس ولحاظ رکھتے ہیں وہاں معروضیت سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ تمام باتیں آپ کے مضامین کے زندہ عناصر ہیں۔ آپ نے اپنی بیدار مغزی، وسیع القلبی اور ہمہ جہت مطالعہ کی وجہ سے اردو ادب وتنقید میں مستقل مقام بنالیا ہے۔

❁❁❁

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی
سابق صدر شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

ترقی پسند تنقید اور فضل امام

سید فضل امام رضوی کا ادبی تعلق اصلاً مشرقی ادبی صورتوں سے رہا ہے۔ وہ فارسی اور عربی زبان وادب کے منتہی رہے ہیں مگر بعد کو اردو اور ہندی ادب سے ان کی دلچسپیاں وابستہ ہوئیں تو اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کر اور ہندی ادب میں وہ وڈیا واچسپتی سے بھی ''سجت'' ہوئے۔ راجستھان میں تقریباً چودہ پندرہ برس شعبۂ اردو سے وابستہ رہے اور پھر اردو ادب کے شیفتہ ہو گئے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں بیشتر اردو تنقید سے متعلق تھیں۔ ان کی کتابوں میں سے امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری (تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری) بھوجپوری ادب کا تعارف، جدید ہندی شاعری: سمت و رفتار، انیس: شخصیت اور فن، شاعر آخرالزماں: جوشؔ ملیح آبادی، مشرقی انتقادیات اصول و نظریات، تنقیدی معیار، علامہ اقبال کی اساسِ فکر (۲۰۰۶ء) ابھی تک کی خاص تنقیدی کتابیں ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، فضل امام، اصلاً مشرقی تنقید اور مزاج کے ناقد ہیں اور ادب کو انھیں مشرقی معیاروں سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اردو کی کلاسکی تنقیدی کی کیفیت اور ابعاد کو سمجھنے میں خاص مدد ملتی ہے مگر، ان کی دلچسپیاں رفتہ رفتہ

ترقی پسند تنقید سے جب پیدا ہوئیں تو انھوں نے اس طرز تنقیدی کو بھی اپنی تنقیدی فکر میں شامل کرلیا، اور پھر ترقی پسند تحریک اور اردو ادب، جدید اردو تنقید کا کوہ کن پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر احتشام حسین کا اسلوب، شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی اور اقبال اور جمہوریت، جیسے مضامین لکھے۔ ترقی پسند تحریک کے لئے لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک، درحقیقت امید کی ایک حیات بخش کرن بن کر منصۂ شہود پر آئی جس نے اردو کی ادبی فکر ونظر کو بھرپور جلا اور توانائی عطا کی ذہنی بیداری اور عوامی رہنمائی میں اس تحریک نے زبردست رول ادا کیا۔ نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں بالخصوص اس تحریک کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ ایک نئے سیاسی اور ادبی شعور نے جنم لیا جس میں توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی اور سڑے گلے، رسم ورواج کی قطعی گنجائش نہیں تھی، سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیردارانہ جبر وتشدد کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ مزدور، محنت کش، مظلوم و مجبور افراد کو حوصلہ حاصل ہوا اور وہ بھی مردانہ وار انسانی سماج کی فلاح و بہبود کے لئے کھل کر سامنے آئے۔''[1]

ترقی پسند ادب کے لئے ان کے یہ خیالات اوپری نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اب اس کے دل سے قائل ہیں کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ ادب کا ارتقا زندگی اور سماج کے ارتقا کے ساتھ ہی وابستہ ہے اور یہ جو روز بروز زندگی میں اتار چڑھاؤ آتا جاتا رہتا ہے، ادب اور زندگی دونوں ہی پر ان کا اثر پڑے گا۔ جس ادیب کو اس کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ اپنی اور دوسروں کی تخلیقات کو انھیں پیمانوں سے ناپے گا، وہ یقیناً زندگی کی ارتقا پذیر صورتوں کا حامی ہوگا خواہ وہ مارکسی نقطۂ نظر سے اس یقین تک پہنچا ہو یا

عام حالات کے ساتھ زندگی کی نامیاتی صورتوں کا ہم نوا ہو کر فکری اور عملی طور پر یہاں تک آیا ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اُردو ادب نے ہندوستانی سماج کی نمایاں تبدیلیوں کو اپنے دل میں اُتارا اور مختلف اصناف سخن اور اصناف ادب کے ذریعہ تحریر کے بنیادی نقطۂ نظر کو دلکش انداز سے پیش کیا۔ ادب کو صرف ذہنی تعیش اور نام نہاد شرفا یا ایک مخصوص طبقے کی جاگیر ہونے سے بچا لیا گیا۔ ادب اور سماج کے رشتوں کو استوار بنایا گیا۔ زندگی کو طلسماتی دنیا سے نکال کر واقفیت کا ترجمان بنایا جس میں ہماری زندگی کے شب و روز نظر آنے لگے......... سماجی نا برابری کی لعنتوں کو دور کرنے کے لئے ادبی فکری اور فنی سطح پر بھی جہاد کے لئے اس تحریک (ترقی پسند تحریک) نے انقلاب آفریں خدمات انجام دیں........ اظہار خیال کے لئے ہیئت اور معنی میں تبدیلیوں کی ضرورت کو اس اعلیٰ تحریک نے جائز قرار دیا اور روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کا سلیقہ سکھایا........ اردو ادب کے لئے یہ بہت نیک شگون تھا۔'' [1]

ترقی پسندی اور اس کی تفہیم فضل امام کے یہاں خاصی متوازن ہے اور ترقی پسندی کی بنیادی باتوں اور مسائل کو لے کر چلتی ہے۔ ان کی تحریر کا لہجہ، اگر چہ عام طور پر جارحانہ ہوتا ہے مگر ترقی پسندی کی بحث میں انھوں نے افہام و تفہیم کے رویے کے برتنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کا ادبی پس منظر، فارسی اور عربی ادب کا ہے، اس لئے وہ اپنے استناد کے لئے فارسی اور عربی ناقدین کے گراں بہا اقوال کی مدد لیتے ہیں جسے اردو کے تنقید نگار تقریباً فراموش کر چکے ہیں اور چلتے

ہوئے انگریزی ناقدین کے جملے اور خاص طور پر اقوال اور اسمائے گرامی کا ذکر کر کے قاری کو مربوط کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہاں رسم دنیا اور نئی تحریروں کی روایت کے کبھی کبھی مغربی حوالے اور اقوال پیش کر دیتے ہیں مگر ایسی صورتیں ان کی تحریروں میں بہت کم ہیں۔ شعراء اور ادیبوں کے تجزیوں میں بھی فضل امام اپنی مشرقی طرز تنقید کی صورتوں کو نہیں چھوڑتے اور ان کے وہ تمام طریقے اپنا لیتے ہیں جو ادب کی ارتقائی صورتوں میں معین ہوتے رہے ہیں۔ وہ خالص مارکسی اور اشتمالی طریقوں ہی کو ادب کی کسوٹی نہیں مانتے بلکہ قدیم ادبی معیاروں سے بھی کام لیتے رہتے ہیں ایسے معیار جو ادب میں زندگی اور جان پیدا کرتے ہیں۔

اپنے جملہ مشاغل میں سے ان کا ایک کام مجلسی تقریریں بھی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جیسے اس کام نے انھیں کچھ انتہا پسند بھی بنا دیا ہے جو تنقید کی دنیا میں توازن باقی نہیں رکھتا۔ کبھی کبھی ان کی تنقیدی گفتگو میں انتہا پسندی داخل ہو جاتی ہے اور وہ قارئین کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے تہدید اور ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لینے لگتے ہیں جو ''منبر کی تہذیب'' میں تو شاید ہو سکتا ہے اور چل بھی جائے گا مگر ادب کی دنیا میں کارآمد نہیں ہو سکتا کہ اس میں قاری اور سامع کو اپنی آزادہ روی اور نجی سوچ کی بہر حال اجازت ہے اور تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایسی ایک مثال فضل امام کے تنقیدی مضامین سے یہاں پیش ہے اپنی حالیہ کتاب ''علامہ اقبال کی اساسِ فکر'' میں لکھتے ہیں:

> ''مومن ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ صاحب لولاک ہو۔ صاحب لولاک وہی ہے جو چاند کے دو ٹکڑے کر سکے۔ غروب آفتاب کو طلوع آفتاب میں بدل سکے..... تاریخ کائنات میں کتنے اللہ کے شیر ملتے ہیں؟ واضح رہے کہ اسد اللہ تو ایک ہی نظر آتا ہے اور

وہ سوائے مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب شاگرد سرور کائنات محمدؐ کے دوسرا نہیں........اقبال گہری بصیرت اور امید کے ساتھ اس شر ریا قوتِ حیدری کا مطالعہ کرتا ہے، تب اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ یہ ایک ازلی قوت ہے۔ اس کو فنا نہیں یہ ہر زمان و مکان میں مصروف ہے۔ یہ اتنی گراں قدر اور بیش بہا ہے کہ دنیوی سلطنت اس کے مقابلے میں خس وخاشاک سے بھی کم درجہ رکھتی ہے:ع

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی!

ایسی عبارت سے عقیدے اور آستھا کی باتیں تو ہو سکتی ہیں مگر ادبی تنقید میں یہ کار آمد نہیں ہو سکیں گی۔ ترقی پسند تنقید ادبی توجیہات اور تعقلی (Reasoning) صورتوں کے ساتھ ہی چل سکے گی تاہم فضل امام کا تنقیدی اپروچ (Approch) تنقید میں ہمیشہ ایجابی ہوتا ہے وہ زندگی اور انسانیت نیز تخلیقات میں ہمیشہ مثبت رویوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور تعمیری صورتوں کے حق میں رہتے ہیں کہ مشرقی تنقید میں کبھی عصبیت کہیں ممدوح نہیں سمجھی گئی۔ ایسی قدروں کی وہ پاسداری کرتے ہیں جو زندگی کو بہتر بنانے کے حق میں ہوا کرتی ہیں اور ادب وہی قابل قدر اور لائق احترام ہے جو انسانوں کی فکری تخئیلی جذباتی اور معاشی بہتری کے لئے کوشاں ہو اور نفرت، بغض وعناد، خود غرضی، لوٹ کھسوٹ نیز منافقت سے انسانی سوسائٹی اور سماج کو دور رکھے۔ یہی ترقی پسندی ہے اور یہ صورتیں فضل امام کی تنقیدی کا ماحصل ہوا کرتی ہیں۔

(ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ سے ماخوذ)

❀❀❀

ش۔ک۔نظام
جودھپور

ڈاکٹر فضل امام......بحیثیت نقاد

یونانی نقاد ہورلیس نے ایک جگہ کہا ہے: ''میں (نقاد) اس سان کا کام کروں گا جس سے چاقو اور تلوار پر دھار رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ اُس (سان) میں کاٹنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ نقاد کسی فنکار کے لیے کیا کرسکتا ہے اور کسی بھی نقاد کو فنکار کے لیے کیا کرنا چاہیے ہورلیس نے تو صرف یہ بتایا ہے۔ لیکن نقاد کو قاری کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ ادب کا ایک سنجیدہ قاری کسی بھی نقاد سے کن کن چیزوں کے لیے تقاضا کرتا ہے؟ کیا کیا توقعات وابستہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن (W.H.Auden) بتاتا ہے کہ ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک یا زیادہ خدمات انجام دے:

اُن مصنفین یا تصانیف سے مجھے متعارف کرائے جن سے ہنوز میں ناواقف تھا۔

مجھے قائل کرے کہ میں نے کسی تصنیف یا مصنف مخصوص کو اس لیے کمتر یا ہیچ تصور کیا کہ میں نے اُن کا مطالعہ خاطر خواہ توجہ سے نہیں کیا۔

مجھے مختلف ادوار کی تصانیف اور تہذیبوں میں رشتے بتائے جنھیں میں اب تک نہیں دیکھ سکا تھا اور اپنی محدود معلومات کے سبب میں انھیں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ میرے لیے کسی تصنیف کا ایسا مطالعہ (Reading) پیش کرے کہ میری فہم و فراست کو جلا میسر آئے۔
وہ فن کارانہ تخلیق (Making) پر روشنی ڈالے۔
وہ فن کے، زندگی، سائنس، معاشیات، علم الاخلاق، مذہب وغیرہ سے رشتوں کی افادیت پر روشنی ڈالے۔

متذکرہ بالا خدمات میں سے پہلی تین خدمات کے لیے آڈن علمیت (Scholarship) کو ضروری خیال کرتا ہے، لیکن وہ اس بات کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ عالم وہ نہیں ہے جس کی اطلاعات کا دائرہ وسیع ہو۔ آخری تین خدمات کے لیے اس کے خیال میں Superior Knowledge نہیں بلکہ Superior Insight درکار ہے۔ آڈن ہی کی طرح ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''میں اُس نقاد کا بے حد ممنون ہوں جو مجھے کسی ایسی چیز (تصنیف) کی طرف متوجہ کرے یا کوئی ایسی چیز دکھائے جس کی طرف میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی تھا تو تعصب کے دبیز چشمے سے۔ اس کا (نقاد کا) تفاعل صرف اتنا ہے کہ وہ میرا اُس چیز سے آمنا سامنا کروا دے اور اس کے بعد مجھے تن تنہا چھوڑ دے۔ اس لیے بھی کہ اس کے بعد مجھے اپنی ذہانت، احساس اور دانائی پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

ہورلیس اپنے تفاعل کا تعین خود کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ نقاد فن کار کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے والا اس کی تخلیقی توانائی کو تیز وطرار کرنے والا ایک اہم آلہ ہے

جب کہ آڈن اور ایلیٹ بحیثیت قاری نقاد کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ان بیانات کے مطالعہ سے ہمارے سامنے ایک مثلث متشکل ہوتا ہے۔ تصنیف رمصنف، نقاد اور قاری۔

اُسی زبان کا ادب ترقی کرتا ہے جس میں یہ مثلث متوازن اور اپنی ذمہ داری سے باخبر ہو۔ اب اسے ہماری زبان کی بد نصیبی نہیں تو اور کیا کہیئے کہ ہمارے یہاں یہ مثلث نہ صرف غیر متوازن رہا بلکہ اس کا وجود ہی مشکوک رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سرِ دست ایک دو موٹی موٹی باتوں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا ادب شاعری کے شکنجے میں اس قدر کسا رہا ہے کہ ہم میں سے اکثر حضرات آج بھی شاعری کو ہی ادب سمجھتے ہیں اور کچھ شاعری کو ادب کا مترادف خیال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری ادب کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے بنا ادب کا تصور نامکمل ہے۔ لیکن شاعری ہی ادب نہیں۔ اور پھر وہ شاعری تو ہرگز نہیں جس کی خوبی اور خرابی سماعت کی مرہونِ منت ہو۔ تو میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ادب کا محمول (Concept) نہایت ادغام آمیز رہا ہے۔ کیوں کہ ہم تو سماعی شاعری کو ہی ادب سمجھتے رہے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ایسا صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں ہوا۔ دیگر زبانوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہے لیکن دیگر زبانوں کے ادبی آفاق پر جو جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اُن سے ہم لوگ ایک لمبے عرصے تک ناواقف رہے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کی شاعری ہی کیوں دیگر علوم بھی Vocal اور Verbal رہے ہیں۔ یہ روایت بہت قدیم ہے اور زبان کی توسیع و ترقی میں اس نے بہت نمایاں رول ادا کیا ہے۔ لیکن اس نے شاعری کو نقصان پہنچایا ہے اور آج بھی پہنچا رہی ہے۔ اس طرف ہمارے یہاں

غالباً علامہ اقبالؔ نے سب سے پہلے توجہ کی۔ چراغ حسن حسرتؔ نے علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''ایک دن مشاعروں کا ذکر آ گیا تو فرمایا ''اُردو شاعری کو ان مشاعروں نے کھویا۔'' میں نے پوچھا ''وہ کیسے؟'' کہنے لگے'' مشاعروں میں بھلے برے سب شریک ہوتے ہیں اور داد کو شعر کی اچھائی اور برائی کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُردو شاعری نے عوام کے مذاق کو اپنا رہنما بنا لیا۔'' میں نے عرض کیا، ''اِن مشاعروں نے تو اُردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔'' فرمایا، ''زبان کو فائدہ پہنچایا اور شاعری کو غارت کر ڈالا۔''

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں تصورِ تنقید بھی واضح نہیں۔ ہم معترض اور نقاد میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم نکتہ چین اور نکتہ رس کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہمارے تذکرے جن میں ہمارا قدیم سرمایۂ تنقید (؟) محفوظ ہے، یا تو الفاظ کی گرفت کے گرد وغبار سے اَٹے پڑے ہیں۔ یا شخصیتوں میں سیندھ لگانے کی پینترے بازیوں سے لدے پھندے ہیں۔ اس کے بعد جو حضرات نقاد کہلائے گئے اُن کا بھی قریب قریب اسی طرح کی اکھاڑے بازیوں کو تنقید کہنے سمجھنے کا شیوہ رہا۔ کسی نے زیادہ زور مارا تو چند عروضی اصطلاحات از بر کر لیں اور لگا دھونس جمانے۔ کسی نے محاورات کو ہی اپنا محاذ بنا لیا اور عرفِ عام میں نقاد کہلایا جانے لگا، تو کسی نے ارکان شماری (فعل، فعولن) کو ہی تنقید سمجھ لیا۔ کسی نے زبان اور روزمرہ کا راگ الاپا، تھوڑی زبانی جمع خرچ کی، بحث و تمحیص کی، اور بس۔ تو اس روش نے ہمارے یہاں کئی ٹٹپونجیوں کو نقاد بنا دیا۔ آج سے بیس پچیس سال قبل تک تو ایسے ہی

لوگوں کی کاواک تحریروں کو تنقید کا تاج پہنایا جاتا تھا اور معاف فرمائیں زمین مریدوں اور مرادوں سے آج بھی خالی نہیں ہے۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، اصل میں ایسے ہی اسباب کی نوازش کے پاداش ہمارے یہاں تصنیف، نقد اور قاری کا مثلث پوری طرح تشکیل ہی نہیں ہو پایا۔ کیونکہ قارئین کو پنپنے ہی کہاں دیا گیا بس سامعین تھے۔

ایسے ایسے سرخیل شعرا اور مسیحائے فن سے جن کے ذہن میں تنقید کا مطلب اور مقصد ہی مبہم ہو، اگر یہ پوچھا جائے کہ تنقید اور تبصرے میں کیا فرق ہے، یا ان کی کیا ماہیت ہے یا ان کے کیا تفاعل ہیں، تو لوگ ہمیں ہی جہالت مآب کہیں گے۔ اور اگر ان کے متعلق ہم نے کچھ کہا تو وہ توثیق میں سند طلب کریں گے، کیوں کہ انھیں تو سند طلب کرنے اور پیش کرنے کا ایسا چسکا پڑا ہے کہ وہ تو بنا سند کے لقمہ بھی نہیں توڑتے۔ بزرگوں کے چبائے ہوئے نوالے چباتے چباتے اب تو ان کی زبان نئی چیز کے ذائقہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ ان کے لیے تو دعائے خیر کیجیے۔ لیکن ہمیں اپنے طور پر یہ ضرور جان لینا چاہیے کہ تنقید اور تبصرہ میں کیا فرق ہے؟ یہ بات تو مسلم ہے کہ افسانے اور ناول کی طرح تنقید کا جو روپ آج ہمارے یہاں مروّج ہے وہ مغرب کی ہی دین ہے۔ ان کے یہاں تنقید کے لیے Criticism اور تبصرے کے لیے کی Review اصطلاح مستعمل ہے۔ جس کی تعریف اجمالاً یوں ہو سکتی ہے کہ تنقید علم Study کا وہ شعبہ ہے جس کا تعلق تعین، تفسیر، تشخیص اور قدر و قیمت سے ہے اور تبصرہ وہ مضمون ہے جس میں کسی نئی تصنیف کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو۔ تبصرہ کسی تصنیف کا ایسا تذکرہ ہے جو کسی رسالہ یا خبرنامہ کے لیے مخصوص اور اس کے مزاج کے عین مطابق و موافق ہو۔ تبصرہ، نقاد یا تبصرہ نگار کا کسی تصنیف کے متعلق فوری ردِعمل ہے۔ جب کہ تنقید نقاد کے پورے مطالعہ، غور و فکر اور

علم کا عطر ہے۔ تبصرہ نگار جس تصنیف کو فوری ردِّ عمل پیش کرنے کے بعد فراموش کر دیتا ہے، نقاد اُسی تصنیف کو ماضی اور حال کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ شاید اسی لیے ایلیٹ نے کہا تھا کہ نئی تصنیف کا منظرِ عام پر آنا پورے ادبی سرمائے کا از سرِ نو تعین کرنا ہے۔ تو اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید کسی تصنیف کی روشنی میں پورے ادبی نظام و اقدار کے مطالعہ اور اس کے تعین کا نام ہے اور تبصرہ کسی تصنیف کا منفرد مطالعہ ہے۔ تبصرے کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کلیم الدین احمد نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''تبصرہ کا مقصد ہے کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اور اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اور جو کچھ کہا جائے اُس سے کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں (خوبیاں اور خرابیاں دونوں) واضح ہو جائیں۔''

اس ضمن میں، میری محدود معلومات کے مطابق، سب سے اہم مضمون شمس الرحمٰن فاروقی نے ''تبصرہ کا فن'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اُردو میں تبصرہ نگاری اب کہاں تک پہنچی ہے اس کے لیے فاروقی کی تصنیف ''فاروقی کے تبصرے'' کا مطالعہ ناگزیر ہے اور قدیم تبصرہ نگاری کے لیے مولانا نیاز فتح پوری کی مالہ ماعلیہ ہے ہی۔

بندہ نواز! مجھے معلوم ہے کہ مجھے یہاں تنقید اور تبصرے کا درس دینے کے لیے کھڑا نہیں کیا گیا ہے اور نہ درس و تدریس کا میں اپنے آپ کو اہل سمجھتا ہوں اور نہ میں خلط مبحث کر رہا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کہا ہے کہ ہمارے یہاں تنقید کی تفسیر نہایت غیر مبہم ہے اور ہم نے چند ایسے Snobs کو بھی نقاد سمجھ لیا ہے جن کا تنقید سے کوئی تعلق نہیں ہے..... پھر اُردو کے مدرسی مدفن بھی آج کل تو نقاد کہلاتے ہیں تو میں جب ڈاکٹر فضل امام کو نقاد کہوں تو آپ انھیں نہ تو اُن لوگوں میں شامل سمجھیں جن کے نزدیک لفظی گورکھ دھندہ ہی تنقید ہے یعنی یہ استغفر اللہ، سبحان اللہ اور لاحول ولاقوۃ

والے نقاد نہیں ہیں۔ نہ ڈگریوں کی ڈگڈگی بجا کر اپنے آپ کو نقاد منوانے کے خبط کے شکار نہ شعبۂ اُردو کے تاج دار اور طلبا کے قافلہ سالار قسم کے نقاد ہیں.... یونیورسٹی میں رہ کر بھی انھوں نے Class Room Criticism سے بچنے کی مسعود کوشش کی ہے اس لیے خدا کے لیے اُنھیں اُن علماء وفضلا میں بھی شمار نہ کریں...... ان کی تنقید تحقیق کی شان لیے ہوئے ہے بلکہ یوں کہیے کہ ان کے مقالات میں تحقیق کا عنصر زیادہ ہے....... اور یہ تحقیق، تاریخ کا بیان نہیں ہے، بلکہ ادبی اسباب دریافت کرنے کا کام انجام دیتی ہے....... پھر ادب میں کہیں پہنچنا اور نہیں پہنچنا سب برابر ہے اُس میں اصل کام تو چلنا ہے...... اس لیے فضل امام صاحب کا راستہ بہت طویل ہے اور ہر اُس شخص کا راستہ طویل ہوتا ہے جو لکیر کا فقیر نہیں ہوتا۔ اُسے قبول کرنے میں تو اور بھی زیادہ وقت لگتا ہے ...... پھر امام صاحب تو اُن لوگوں میں سے ہیں جو فنکار بھی ہوتے ہیں اور ناقد بھی اس لیے ان کا راستہ تو طویل تر ہے۔ ایسے نقاد شاعر کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ پہلے یہ بات واضح کر دوں کہ نقاد کے مروّجہ معنوں سے امام صاحب الگ ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام صاحب ناقد بھی ہیں اور شاعر بھی تنقید، جس کا تعلق علم سے ہے اور علم کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے..... شاعری فن ہے اور فن کا تعلق اقدار سے ہوتا ہے۔ اسی لیے تو فن اُن تمام کوششوں کا نام ہے جو انسان کو مہذب انسان بناتی آرہی ہیں۔ اس لیے فن کا مقصد معاشرے میں مہذب انسان پیدا کرنا ہے جب کہ علم اُس مہذب انسان کو محفوظ رکھنے کا نام ہے۔ علم ایک ایسا تحفظ ہے جو مہذب انسان کو پھر سے غیر مہذب بننے سے روکتا ہے...... فن کی بنیاد 'دیکھنے' پر ہے اور 'دیکھنے' کے لیے ایک Non-Resistance ذہن چاہیے۔ ایسا ذہن جب دیکھتا ہے یا دیکھ کر ورک حاصل کرتا ہے تو اس کا علم کنویں کے پانی کی طرح ہوتا ہے۔ جب کہ Resistance

رکھنے والا ذہن جب ادراک حاصل کرتا ہے تو اس کا علم حوض کے پانی کا سا ہوتا ہے۔ کنویں میں پانی اندر سے باہر آتا ہے اور حوض میں پانی باہر سے اندر جاتا ہے دونوں میں فرق ہے۔ امام صاحب کے شعر نان ریزسٹنس ذہن کا اظہار ہیں۔ اُن کا 'کھوجنا' اور 'پانا' ایک نقاد کا کھوجنا اور پانا نہیں ہے۔ اس لیے ہر آدمی یہ سوچتا ہے کہ کوئی بھی آدمی دوناؤں پر پاؤں کیسے رکھ سکتا ہے۔ اگر وہ اچھے ناقد ہیں تو وہ اچھے شاعر نہیں ہو سکتے اور اگر اچھے شاعر ہیں تو پھر اچھے تو کیا، نقاد ہی کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں کا علم حوض کا پانی ہے یعنی سیکھا ہوا ہے۔ جسے کسی نہ کسی نے سکھایا ہے۔ کنویں کے پانی سا 'جانا ہوا' نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو مجھے شوق سے مغرب زدہ کہیں یا مغرب کا مقلد کہیں لیکن میں یہ کہنے سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتا کہ مغرب والوں کا علم کنویں کا پانی ہے، وہ جانا ہوا ہے...... ہمارا علم سیکھا ہوا ہے جانا ہوا نہیں...... سیکھا ہوا تو ہمیں یاد رہا کہ نہیں رہا لیکن سکھانے والا ضرور یاد رہا اور اس یاد نے ہم میں عقیدت پیدا کی۔ عقیدت نے ہم میں یقین کی داغ بیل ڈالی۔ ایقان اور عقل میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ عقل بیسیوں طرح کے سوالات اٹھاتی ہے، اور سوالات یقین کی صحت کے لیے مضر ہیں...... یقین عقل کے نیچے ہے جب کہ منطق اس کے اندر...... اسی لیے ہم کسی ایسی شخصیت کا تصور ہی نہیں کر سکتے جو دو سمتوں میں سفر کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو..... میں نے دو سمتیں کہا ہے، مخالف سمتیں نہیں کہا ہے..... اب دوسری اہم بات یہ ہے کہ نظم و نثر ہمیں بھی فرق ہے..... نظم الفاظ کی مرہونِ منت ہے جب کہ نثر زبان کا جادو جگاتا ہے۔ اسی لیے تو نظم میں لفظ کا تخلیقی اور شخصیت کا تحلیلی استعمال ہوتا ہے اور نثر میں لفظ کا ترسیلی اور شخصیت کا توضیعی۔ بقول شخصے نثر دور تک اُڑ سکتی ہے مگر شاعری کی اُڑان اُونچی ہوتی ہے ..... نثر میں لفظوں کے معنی

Horizental ہیں جب کہ نظم میں Vertical۔ اِس ضمن میں جورگ بورہس کا خیال بھی قابل ذکر ہے وہ کہتا ہے:

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاعری اور نثر میں اخلاق یہ نہیں ہے
[جیسا کہ بہت سے لوگوں نے کہا ہے] کہ ان میں الفاظ جس نمونے پر
برتے جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں بلکہ ان میں
فرق یہ ہے کہ دونوں کو مختلف طرح سے پڑھا جاتا ہے۔ اگر کوئی عبارت
اس طرح پڑھی جائے گویا اس کی مخاطب عقل ہے تو وہ نثر ہے اور اگر وہ
اس طرح پڑھی جائے گویا اس کی مخاطب تخیل ہے تو وہ نظم ہوسکتی ہے۔"

تو اس طرح جب کوئی شخص بہ یک وقت، نظم اور نثر، دوسمتوں میں محوسفر ہو یعنی جو عقل و تخیل دونوں سے مخاطب ہو تو دل میں ایک اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص جب اقدار سے محو گفتگو ہوتا ہے تو اس کا لب ولہجہ کس طرح کا ہوتا ہے اور یہی شخص جب علم یعنی حقائق سے کلام پیش کرتا ہے تو کس طرح کی لفظیات سے استفادہ کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تخیل سے مخاطب ہوتے وقت اس کا لب ولہجہ اور لفظیات کا انتخاب عقل سے گفتگو کرنے کے لیے تو موزوں اور موافق ہو لیکن تخیل کے مزاج کے مطابق نہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عقل سے بات چیت کرتے وقت وہ انداز اختیار کر بیٹھے جو تخیل کے مزاج کے موافق ہو..... ایسی صورت میں، بہت ممکن ہے کہ دونوں جگہ ناکامیاب رہے اور اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دونوں ہی مقامات پر کامیاب رہے ..... ان امکانات کے ساتھ ایک تخص یہ بھی ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو اُسے دونوں (عقل و تخیل) سے مخاطب ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ آخر کوئی تو ایسی جذباتی اور ذہنی ضرورت ہوگی جو اُسے دونوں سے مخاطب ہونے کے لیے متحرک کرتی ہے......

آخر کچھ تو ایسا ہوگا اُس میں جو اظہار تو چاہتا ہو لیکن کسی ایک ہی Medium کی دسترس سے باہر ہو...... یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود اُس شخص کی ہی کمزوری ہو اور Medium بالکل ٹھیک ہو..... اگر اس کی تحریروں سے یہ بات واضح ہو جائے کہ کمزوری فن کار کی ہے تب تو اس کی تحریروں کا مطالعہ تضیع اوقات سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تب ہمیں اس کی تخلیقی توانائی کے تناظر میں ہیئت کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ لیکن ٹھیک یہیں میں آپ حضرات سے ایک اور نکتہ کی طرف توجہ کرنے کی گزارش کروں گا اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ایک ہی فن کار میں دو شخصیتیں بھی تو سانس لے سکتی ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام اسی قبیل کے فن کاروں میں ہیں۔

آج کے اس ادبی اجتماع میں، میں ان کے چند مضامین پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں ان کے مضمون ''تنقید اور اس کی ماہیت'' پر کچھ عرض کروں گا۔ جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے اس مضمون میں امام صاحب نے تنقید کیا ہے؟ تنقید کو کیا ہونا چاہیے؟ تنقید کیا نہیں ہے؟ اس قسم کے سوالات کا جواب دیا ہے۔ مضمون کی شروعات ہی ان جملوں سے ہوتی ہے:

> ''تنقید نہ تو کھوٹے کھرے کی پرکھ کا نام ہے، نہ تو دودھ کا
> دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا عمل ہے اور نہ سوپ سے اناج صاف
> کر کے بھوسا علاحدہ کرنے کا طریقۂ کار ہے۔''

مضمون کا آغاز ہی بتاتا ہے کہ نقاد نے سب سے پہلے مروّجہ نظریات کو مسترد کرنا چاہا ہے لیکن اگر تنقید یہ نہیں ہے۔ تنقید یہ بھی نہیں، تنقید وہ نہیں ہے اور تنقید وہ بھی نہیں ہے تو پھر تنقید ہے کیا؟ جواب میں وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید دراصل کسی بھی شے کی حقیقت کے صحیح اور سچے عرفان کا نام ہے۔''

پھر سچی اور صحیح تنقید کے فرائض بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''ہر سچی اور صحیح تنقید کا فرض یہ ہے کہ وہ خلاق کے دل میں جھانک کر اس کی روح کی نقاب کشائی کرے لیکن خلوص کی شمولیت بہر طور ضروری ہے۔''

وارث علوی صاحب نے ایک جگہ لکھا تھا: ''تنقید نقابوں کو پھاڑنے اور گریبانوں کو چاک کرنے کا نام ہے''.....وارث صاحب کے نزدیک ''تنقید بُت شکنی کا عمل ہے۔'' لیکن یہیں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بت شکنی کا مطلب تخریب نہیں ہے بلکہ جہاں ایک طرف وہ بت توڑنے کا عمل ہے وہیں دوسری طرف وہ کعبہ سازی کا عمل بھی ہے۔ جہاں یہ خلاق کے دل میں جھانک کر اس کی روح کی نقاب کشائی کرنے کا نام ہے وہیں یہ اُسے نئے جاموں سے مزین کرنے کا عمل بھی ہے۔ نئے جاموں سے مزین کرنے کو ہی امام صاحب نے خلوص کی شمولیت کہا ہے۔ لیکن نئے جامہ زیب تن کروانے کے معنی چادر چڑھانا نہیں ہے اور نہ ہی چراغی مانگنا ہے ......کرسٹوفر رکس (Christopher Ricks) نے کہا تھا: ''تنقید ادب کے بارے میں اپنے احساس و افکار کے وجوہ بیان کرنے کا عمل ہے۔ تنقید رائے کو علم میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔'' اسی لیے مجھے لگتا ہے امام صاحب، آڈن کے بیان کردہ پہلے تین اوصاف سے مالا مال ہیں، جن کے لیے علمیت بنیادی شرط ہے۔

میرے خیال میں ہر ذی فہم شخص فضل امام صاحب کی اس بات سے متفق ہوگا کہ اندھی تقلید کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ وہ مغرب کی ہو کہ مشرق کی۔ اس ضمن میں انھوں نے نجم الہدیٰ صاحب کا ایک قول نقل کیا ہے:

''.....اُردو میں لفظ تنقید اسی انگریزی لفظ [Criticism] کا بدل اور مترادف ہے۔ چونکہ فنی حیثیت سے اُردو تنقید کا ارتقا مغربی

اصولِ نقد و نظر کا بھی بہت زیادہ رہینِ منت ہے......

اور اس کی تردید میں لکھا ہے: اُردو میں لفظ تنقید عربی زبان و ادب کی دین ہے جو نقد سے مشتق ہے۔

اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ امام صاحب کا کہا ہی صحیح ہے۔ لیکن یہ بات ضرور محلِ نظر ہے کہ لفظ تنقید انگریزی لفظ (Criticism) کا بدل اور مترادف ہے.... اصل بات یہ ہے کہ کوئی لفظ کسی کا بدل یا مترادف نہیں ہوتا...... پھر یہ بات بھی مت بھولیے کہ لفظ Criticism سن کر جو پیکر بنتا ہے وہ لفظ تنقید سن کر نہیں بنتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ہمارے یہاں یہ اصطلاح خاصی ادغام آمیز ہے، جس کا ذکر پہلے ہو ہی چکا ہے ..... اگر یہ Term ادغام آمیز نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ خاکسار کو آپ حضرات کی سمع خراشی کی ضرورت پیش نہ آتی اور نہ ہی امام صاحب کو یہ لکھنا پڑتا کہ:

''تنقید کی یہ انتہائی بدنصیبی رہی کہ اس کے ابتدائی دور میں
اسے صرف نکتہ چینی اور عیب جوئی کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا۔''

خیر، لیکن ایک بات سے شاید فضل امام صاحب بھی انکار نہ کریں کہ اُردو تنقید کا موجودہ روپ رنگ اور رسائی مغرب سے مستعار ہے اور غیر ہندوستانیوں سے متاثر ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ نثر نے ہمارے یہاں بہت بعد میں ترقی کی بلکہ حال ہی میں ترقی کی ہے۔ ورنہ سو پچاس سال قبل تک تو اعتراضات بھی نظم میں ہی کیے جاتے رہے.... اگر نظم سے اکتا گئے تو اُردو شاعری پر تاثرات نما تنقید فارسی نثر میں لکھی جاتی تھی۔

سعادت حسن منٹو پر لکھتے وقت میں نے عرض کیا تھا کہ معمولی سے معمولی چیز کو غیر معمولی بنا دینا ہی فنکارانہ تخلیق (Making) ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فنکارانہ تخلیق تل کا تاڑ اور رائی کا پہاڑ بنانا ہے۔ فنکارانہ کمال فکر کو جذبہ اور

جذبے کو زبان بنانے کا نام ہے۔ فن کارانہ تخلیق قاری میں 'فقدان' پیدا کرتی ہے۔ یہ فقدان ہی کسی تخلیق کو تعریف و توصیف کے حروف کی حدود سے بلند کر دیتا ہے۔ یہ 'فقدان' ہی تحسین کے لیے قاری کو موزوں و مناسب الفاظ کی قلت کے روبرو کر دیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ 'فقدان' ہی تخلیق کو قاری کے لیے گونگے کا گڑ بنا دیتا ہے۔ قاری کسی ایسے ہی عالم، میں تنقید سے رجوع کرتا ہے۔ تنقید سے رجوع کرتے وقت وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہوتا ہے جس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتا۔ اُسے اتنی خبر ہوتی ہے کہ اُسے کسی چیز کی تلاش ہے لیکن وہ کیا ہے؟ یہ اُسے معلوم نہیں ہوتا.... تنقید کے ہوش ربا طلسم میں وہ چلتا ہے، بھٹکتا ہے پھر راہ پر آتا ہے اور ایسے ہی کسی لمحے میں وہ معاً منور ہو جاتا ہے اور کسی آرکمڈیز کی طرح چیخ اُٹھتا ہے۔ ''مل گیا... بس بس... یہی بالکل یہی.... مجھے اسی کی تلاش تھی''.... تو قاری کی تلاش ایک ایسا تجسس ہے جو حصولِ مرام سے قبل یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ کس کی تمنا مضطرب ہے۔ فن کار کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جب وہ تخلیق کر رہا ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل کا یہ پہلو نہایت پراسرار ہوتا ہے۔ وارث علوی صاحب نے شاید اسی لیے کہا ہے کہ اچھا نقاد فن کار کے احساس کے سفر پر نظر رکھتا ہے..... جس نقاد کی نظر فن کار کے احساس کے سفر پر ہو۔ وہ ادیب کو اردلی اور خود کو Boss نہیں سمجھتا اور نہ فن پارے کی ضخامت پر اس کے فک اسفل کا زاویہ بگڑتا ہے۔ پھر اس کی نظر الف کے دبنے یا گرنے تک ہی محدود و مرکوز نہیں رہ جاتی۔ ایسے میں تو اس کے سامنے تنقید کے تفاعل واضح ہونے لگتے ہیں اور وہ کہنے لگتا ہے:

> ''تنقید قوتِ تمیز اور فہم و فراست کے بہت سے گوشوں کو اُجاگر کرتی ہے جس سے عوام (قاری) کی توجہ فن کار، شاعر اور ادیب کی طرف مبذول ہوتی ہے.....''

اُن کا دوسرا مضمون ہے ''اُردو زبان پر ہندو تہذیب اور مذہب کے اثرات'' ایسے عنوان قاری کو چونکاتے ضرور ہیں کیوں کہ اس کے سامنے ''اُردو میں سکھوں کا حصہ'' ''اُردو میں ہندوؤں کا حصہ'' وغیرہ وغیرہ تصانیف موجود ہوتی ہیں۔ دوسرے کی تو دوسرا جانے میرا اپنا یہ سوچنا ہے کہ اُردو اس وقت جس حال میں ہے وہاں اُسے فرقوں میں بانٹنا اُسے کمزور کرنا ہوگا۔ اور ایسے جتنے بھی مضامین نظر سے گزرے ہیں اُن میں چاہے اوران چاہے ایک ایسی ذہنیت منعکس ہوتی ہے جو اور کہیں لے جاتی ہو یا نہ لے جاتی ہو کم سے کم صحیح سمت میں تو نہیں لے جاتی..... میری طرح آپ کو بھی اگر اس عنوان نے چونکایا ہے تو اس مقالہ کا مطالعہ فرمائیے یہ بالکل دوسری طرح کا مضمون ہے۔ یہ مضمون اُردو زبان کی مزاج شناسی میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> دراصل اُردو ہندو ایرانی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نے ہر اس تہذیب اور مذہب سے استفادہ کیا جس سے وہ دوچار ہوئی لیکن کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ موجودہ اصطلاح میں یہ ایک سیکولر زبان ہے۔ جس میں ہر تہذیب کو در آنے کی اجازت ہے لیکن کسی کو اپنی بالادستی جتانے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

> ''اُردو کی تنظیم و ترتیب میں اگر ہندوؤں کی شرکت نہ ہوتی تو یہ اُردو وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی ڈاکٹر امام کا یہ مضمون اُن لوگوں کو تو ضرور پڑھ لینا چاہیے جن کے دماغ میں اُردو کو لے کر ادغام ہے اور جو متعصب ہو کر ہی محاکمہ کر سکتے ہیں۔ ایسے متعصب

ماحول میں صحیح تحقیق اور اس کا اظہار بھی بہت بڑی بات ٹھہرتا
ہے...... یہ مقالہ اُردو زبان کو سمجھنے کی سعی کرنے والے مضامین کی
اہم کڑی ہے۔

ڈاکٹر امام ادب میں نظریے کے حامی ہیں اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی بدولت اُردو میں فراقؔ، جوشؔ، اخترؔ شیرانی، ..... جیسے باشعور شاعر پیدا ہوئے..... زندگی میں تو شاید نظریے کی کوئی اہمیت ہو لیکن ادب میں نظریے کی اہمیت میری حقیر رائے میں کچھ نہیں..... بڑا فن کار نظریہ ساز ہوتا بھی ہے تو فن کے ہی توسط سے..... غرض کہ اس کا نظریہ فن ہی ہوسکتا ہے..... فن کے علاوہ جب وہ کسی نظریے کو تسلیم کرنے لگتا ہے تب وہ فنکار کی بجائے مبلغ ہو جایا کرتا ہے.... دوسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جوشؔ، فراقؔ، اخترؔ شیرانی وغیرہ ترقی پسند تحریک کی بدولت نہیں..... البتہ ترقی پسند تحریک نے اِن لوگوں (فراقؔ اور جوشؔ) سے تعاون حاصل کیا تھا۔ کیوں کہ اگر یہ لوگ ترقی پسند تحریک کی بدولت ہوتے تب تو ان کے یہاں بھی وہی آواز و آہنگ نظر آتا جو دیگر ترقی پسند شعراء کی شناخت ہے..... جوشؔ کے متعلق تو خود ڈاکٹر صاحب کا فرمانا ہے کہ وہ ترقی پسند ادب کے منشور کی پابندی نہیں کرتے..... نظریے کی بحث تو اتنی ہو چکی ہے کہ اب اس کے متعلق بات کرنا تضیع اوقات کے علاوہ کچھ نہیں۔ پھر امام صاحب کے نظریات اور اپنے نظریات کے موازنہ کا یہ محل بھی نہیں ہے، اس لیے اس بحث کو یہیں چھوڑیے..... امام صاحب کی اس رائے سے، جو انھوں نے فیضؔ کے متعلق دی ہے، ہر ذی شعور کو اتفاق ہوگا۔ فیضؔ کے متعلق وہ کہتے ہیں:

فیضؔ کے شب و روز، غزل اور نظم میں صرف ایک ہی محور
پر رقص کناں ہیں جس میں کوئی تغیر نہیں ایک مدھم لے اور ایک ہلکا

زیر و بم نظر آتا ہے.......

وہ یکسانیت جسے امام صاحب نے ایک ہی محور پر رقص کناں کہا ہے ہر اس شاعری کا طرۂ امتیاز ہے جو کسی نہ کسی نظریے کی پیروی کرتی ہے.......

اس طرح فراقؔ کے بارے میں وہ بہت ہی کار آمد اور بصیرت افروز بات کہتے ہیں:

> فراقؔ کے یہاں ایک مستقل تفکر، علم، ارتقا اور ارتفاع ملتا ہے اسی لیے فراقؔ کے یہاں آفاقی اور ہمہ گیر قدروں کا زیادہ احترام ہے۔ جدید و قدیم دونوں اقدارِ حیات کے سنگم کی سب سے اچھی مثال فراقؔ کی شاعری ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی پر لکھے گئے اپنے اس مقالہ میں انھوں نے جوشؔ کے پورے تخلیقی سرمایے کے اوصاف کو ایک جملہ میں بند کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''جوشؔ کی سب سے بڑی خصوصیت انتہا پسندی ہے'' ......کیا نظم اور کیا نثر جوشؔ کے پورے تخلیقی تناؤ کو سمجھنے کے لیے یہ ایک ہی جملہ کافی ہے.....میرے خیال میں شاید جوشؔ کے کسی بھی نقاد نے اتنی وضاحت اور اتنی کفایت کے ساتھ ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا ذکر نہیں کیا۔ جوشؔ کے تصورِ انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> اُردو داں طبقے میں جوشؔ شاعرِ انقلاب کے نام سے مشہور ہیں لیکن ان کا تصورِ انقلاب بالکل نرالا ہے۔ انقلابی تحریکوں کی دلچسپی اور دلبستگی بڑھ کر جنون کی منزل تک پہنچ جاتی ہے اور یہ جنون نظم و نثر دونوں میں نمایاں ہے یہی تاثرات غزلوں پر بھی حاوی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی غزلوں میں سوز و گداز اور تاثیر نام کو نہیں بلکہ ایک

فلک شگاف نعرے کی کیفیت ہے جو بے موقع اور بے محل بھی ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"لہٰذا انقلابی شاعری بھی ایک چھچھلا تیز بہتا ہوا پرنالا ہے جس میں بہاؤ تو بہت ہے مگر گہرائی نام کو نہیں۔"

جوشؔ کے متعلق یہ سب کچھ جاننے لکھنے کے باوجود ان کی زبان کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی زبان برتنے کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں...... جوشؔ کی نظموں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ مشاہدے کو مصور کی طرح زبان کے توسط سے پیش کرتے ہیں۔ جوشؔ کی تخلیقی توانائی کا یہ نیا گوشہ امام صاحب نے اُجاگر کیا ہے لیکن جوشؔ کے موضوع منتخب کرنے کے انداز کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کا ذمہ داران کے زندگی کرنے کے ڈھب کو بتاتے ہیں...... ایک جگہ لکھتے ہیں:

.....اس مقام پر واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح جوشؔ اپنے قیامِ ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں عاجلانہ اقدام کا شکار ہو کے رہ گئے ٹھیک اسی طرح نظموں میں مضامین کے انتخاب میں بھی مستقل فریب خوردہ تصورات کے سہارے چلتے ہیں......"

جوشؔ کے متعلق امام صاحب کا مندرجۂ ذیل محاکمہ اُن کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت پیش کرتا ہے:

"ادب وہ صاف و شفاف نرم چشمہ ہے جو مدھم مدھم نغمگی کے ساتھ بہتا ہے مگر جوشؔ نے اسے تیز بہتا ہوا دھارا تو بنایا صرف وزن و وقار کی گہرائی کو نظر انداز کر گئے یہی وجہ ہے کہ اُن کی سنجیدگی میں بھی تاثیر ناپید ہے۔"

ڈاکٹر امام کے ایک اور قابل قدر مقالے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ مقالہ ہندی شاعری کے متعلق ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے.....اسے ہم اُردو والوں کا تجاہل عارفانہ نہیں تو اور کیا کہئے کہ ہم لوگ ہندی ادب سے خاطر خواہ واقفیت حاصل کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ ہندی ہی کیوں ہم دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں کرتے۔ ہندی کوی بھوانی پرساد مشر نے فیض کی آمد پر ایک شکایت کی تھی کہ ہم ہندی والے جس شوق سے اُردو شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اُس ذوق و شوق سے اُردو والے ہندی ادب کا مطالعہ نہیں کرتے۔ بات کسی نہ کسی حد تک دُرست تھی اور اس کا ثبوت ہمارے ترجمہ کا ادب ہے.....ناگری رسم خط میں جتنا اُردو کا ادب موجود ہے اس کا عشر عشیر بھی ہندی ادب اُردو رسم الخط میں نہیں۔ اس سے فائدہ ہندی والوں کو پہنچ رہا ہے کیوں کہ وہ تو ہمارے ادب سے مستفیض ہو ہی رہے ہیں۔ نقصان میں تو ہم لوگ ہیں۔ اس لیے کہ ہندی ادبا، شعرا نے بھی ایسی قابل ذکر چیزیں سپرد قرطاس کی ہیں جو ہمیں ضرور دیکھنی چاہئیں۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے دیکھی بھی ہیں لیکن تعداد خاطر خواہ نہیں۔ میں یہ بات کہتے ہوئے بھی زیادتی کر رہا ہوں کہ ہمارے لوگوں نے تو ہماری چیزوں کو ہی نظرِ عنایت، کے قابل نہیں سمجھا اس کا ثبوت تیزی سے کم ہوتی اُردو قارئین کی تعداد ہے۔ خیر، ہندی شاعری کا تاریخی تناظر میں جو معروضی مطالعہ ڈاکٹر فضل امام نے پیش کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ سر دست میں اُن کے دو مقالات کا ذکر کرنا چاہوں گا ۱۔ ہندی شاعری میں جدید رجحانات اور ۲۔ ہندی شاعری میں تلسی داس کا مقام۔ پہلا مقام چھایاوادی دور سے شروع ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر امام کے "درحقیقت چھایاواد کا آغاز فرد کی صلاحیت قبول کے ساتھ ہوا..... چھایاوادی شاعر اشیاء کو دیدۂ دل سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ مناظر فطرت میں شعرا

خارجی اشیا کو شمار کرتے تھے۔ لیکن چھایاوادی شاعروں نے داخلیت کو مروج کیا''....
اس مضمون میں ہری اَودھ اور نرالا کا تقابلی تجزیہ اُن کی بصیرت کا ثبوت ہے اور خاصے کی چیز ہے.... مضمون موضوع کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن پر گتی واد اور پر گتی شیل کی اصطلاح میں تھوڑا سا ادغام پیدا ہو گیا ہے شاید اسی لیے چند ایسے قابل ذکر شاعر چھوٹ گئے جن کے بنا جدید ہندی ادب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگیے، مکتی بودھ، شمشیر، رگھوویر سہائے، سرویشور دیال سکسینہ وغیرہ جب ہم کسی زبان کے جدید شعر و ادب کا تذکرہ کرتے ہیں تب اس میں نظریے کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں مقدم مقام جدید کو Sensiblity حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے کے شعرا میں جے شنکر پرشاد اور مہادیوی ورما کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ باوجود ان ناموں کی عدم موجودگی کے امام صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کیوں کہ انھوں نے اُس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے جس کا لمس ہی ہمارے یہاں بعد کے عہد میں ناپاک سمجھا گیا ہے۔

تلسی داس والے مضمون میں موصوف نے تعارف کے ساتھ ساتھ جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ تلسی کی شاعری کے متعلق امام صاحب لکھتے ہیں:

> فن کے نقطۂ نظر سے تلسی داس کے کلام میں شعریت کے ساتھ ساتھ منظر کشی، جذبات نگاری، اخوت، انسانی ہمدردی، درد و تاثیر، سادگی اور مکالماتی انداز اور موزونیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اُن کا یہ قول بھی تلسی کی شاعری کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوتا ہے:

> ''تلسی داس نے اپنی آفاقی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کے نادر نمونے پیش کرتے ہوئے رام چندر کے کردار و عمل کے مثالی گوشوں کو اُجاگر کر کے ہندی ادب کی تاریخ

میں ایک زندگی کی لہر دوڑا دی......ان کے مجموعوں میں ہندوستان کا
ماضی، حال اور مستقبل اپنی مخصوص ادا کے ساتھ جلوہ طرازیاں کرتا ہوا
نظر آتا ہے۔

اِس ضمن میں اُن کا ایک گراں قدر مضمون 'تلسی داس آئینۂ روایت میں' قابل ذکر ہے
جس کا ذکر بہت ضروری ہے لیکن تنگی وقت مانع ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنا
چاہوں گا کہ تلسی کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے.....

اُن کے مضامین راجستھانی لوک گاتھائیں اور راجستھانی لوگ گیت دو ایسے
مضمون ہیں جو اُن کی زندگی سے جڑنے کی للک کا پتہ دیتے ہیں شاید کسی راجستھانی نقاد
نے بھی راجستھان کے شعر و ادب خصوصاً لوک ساہتیہ پر اتنی عرق ریزی سے نہیں لکھا
ہوگا.....ہماری تہذیب میں لوک گیت اور لوک گاتھا کا وہی مقام ہے جو آنکھ میں نظر کا
ہے.....تہذیب کا ابتدائی سرمایہ، اقدار کو انگیز نے کا حوصلہ اور معاشرے کے باشندوں
کی جذباتی جنگ کا غیر رسمی احساس کا لفظی اظہار ہی تو ہے جو آج بھی دُنیا کے دیہاتوں
میں دل بن کر دھڑکتا ہے......میں ذاتی طور پر اسے امام صاحب کا Contribution مانتا
ہوں کہ انھوں نے راجستھانی تہذیب کے معدوم ہوتے نقوش کی طرف سنجیدگی سے
سوچا بھی ہے اور دیگر احباب کو سوچنے کی دعوت بھی دی ہے......

امام صاحب کے کارہائے نمایاں کا اس ادبی اجتماع میں تفصیل سے جائزہ
لینا ممکن نہیں لیکن میں آپ سب حضرات سے اتنی ہی گزارش کروں گا کہ ڈاکٹر فضل
امام کے مضامین کا بغور مطالعہ فرمائیں تاکہ آپ ان کے علم سے استفادہ کرسکیں، اور
اُردو زبان و ادب کے اُن نیک ناموں اور عظیم المرتبت شخصیتوں کے بھی آمنے سامنے
ہوسکیں جن کے اسماء گرامی سے ادبی تاریخیں محروم ہیں۔

ڈاکٹر مخمور کاکوروی

سنجیدہ اور متوازن انیس شناس
پروفیسر فضل امام رضوی

میر انیسؔ اردو کے عظیم مرثیہ نگار شاعر ہیں۔ان کے قدر دانوں، مداحوں، انیسؔ شناسوں اور انیسؔ فہموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہند و پاک میں اردو کے متعدد رسائل کے میر انیسؔ پر خصوصی نمبر اور ان کے فکر و فن پر لکھی گئیں سیکڑوں کتابوں کی موجودگی اس بات کی غماز ہے کہ انیسؔ کی شہرت، مقبولیت اور محبوبیت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے۔ انیسؔ کا کلام ہمہ جہت ہے اور ان کے کلام کی بوقلمونیاں نقد و احتساب کے دائرہ میں مختلف پہلوؤں سے آتی رہی ہیں۔ کلامِ انیسؔ ہر دور میں اپنی وسعتِ فکر و نظر کے باعث مقبول و معروف رہا ہے۔ انیسؔ کی شاعری صرف ایامِ عزا کی شاعری نہیں ہے بلکہ وہ حیات و کائنات کے نشیب و فراز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ آج کے اس دور میں جبکہ شاعری کے حوالہ سے جدیدیت ما بعد جدیدیت، ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ بہت سی اصطلاحات مغرب کی کورانہ تقلید کے نتیجہ میں سامنے آچکی ہیں، کلامِ انیسؔ آج بھی پیشانی ہستی کی مختلف سلوٹوں کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔ انسانی معاشرے کی بصیرتیں اور بصارتیں انیسؔ کے نمودِ فن کی مستحکم دلیل ہیں۔ انیسؔ اپنے مرثیوں میں جس موضوع کو اپناتے ہیں اس کا حق اس

طرح ادا کرتے ہیں جیسے وہ اس کے ماہر ہوں۔ انیسؔ کے مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں جس میں حضرت عباس علمدار کی شہادت کی خبر خیمۂ حسینی میں پہنچنے پر ایک بچہ کی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی کیفیت کو میر انیسؔ نے ایسے موثر انداز میں نظم کیا ہے جسے ایک ماہرِ نفسیات ہی نظم کرسکتا ہے۔ ؎

دوڑا یہ سن کے نہر کی جانب وہ بے خبر
رو کر پکارے شاہ کہ بیٹا چلے کدھر
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ نوحہ گر
بابا کی لاش اٹھانے کو جاتے ہیں نہر پر
میت نہ اُٹھ سکے گی تو خالی نہ آئیں گے
دامن میں ہم کٹے ہوئے ہاتھوں کو لائیں گے

بیت کے آخری مصرعہ میں بچہ کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔

کلامِ انیسؔ پر انتقاد و احتساب کرتے ہوئے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۸۰ء میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف آبِ حیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ انیس جذبات نگاری اور واقعہ نگاری میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ آزاد سے لے کر آج تک جتنے بھی سخن سنج اور معتبر ناقدین گذرے ہیں سب نے آستانہ انیس پر سرِ نیاز خم کیا ہے۔ یہاں تک کہ علامہ شبلی نعمانی جو فارسی و عربی کے متبحر عالِم تھے انھوں نے جب اردو شاعری پر تنقیدی بصیرت سے کام لینا چاہا تو اس بات کا اعتراف کیا کہ انیسؔ اردو کا وہ مستند اور معتبر شاعر ہے جس کی شاعری کا محاکمہ اردو شاعری کی عظمت کی دلیل ہے۔ اس ذیل میں کلاسکی نقادوں کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ناقدین نے بھی انیسؔ کی

شاعرانہ عظمت کا صمیمِ قلب سے اعتراف کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی مایۂ ناز تصنیف یعنی ''موازنۂ انیس و دبیر'' کے بعد اردو مرثیہ بحیثیت صنف سخن پایۂ اعتبار حاصل کرتا ہے اور میر انیس اس صنفِ سخن کے سرتاج قرار پاتے ہیں۔ شبلی نے اردو میں تقابلی تنقید کی بنیاد ڈالی اس سے کوئی بھی صاحبِ نظر صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

انیس شناسوں کی فہرست میں ایک نام پروفیسر فضلِ امام رضوی کا بھی ہے جن کا قلم گذشتہ پانچ دہائیوں سے مسلسل رواں دواں ہے۔ وہ ایسے نقاد ہیں جو کسی بھی موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں اس کے بعد ہی اپنی کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ اسی لئے اردو ادب میں ان کی رائے بہت متوازن اور نپی تلی ہوئی تسلیم کی جاتی ہے جس سے انحراف کرنا آسان نہیں۔ مشرقی اور مغربی تنقیدی اصول و نظریات پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ ان کی تصانیف میں امیر اللہ تسلیم: حیات وشاعری (تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی)، انیس: شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔ لٹ) جدید ہندی شاعری: سمت و رفتار، شاعرِ آخر الزماں: جوش ملیح آبادی، مشرقی انتقادیات: اصول و نظریات، انیس شناسی، بھوجپوری ادب کا تعارف، افکار و نظریات، علامہ اقبال کی اساسِ فکر، راجستھانی زبان و ادب: ایک تعارف، اردو شناسی، تنقیدی معیار، عثمان عارف ایک مطالعہ، امعانِ نظر، کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی دبستانِ شبلی کے ہی ایک نقاد ہیں جنھوں نے میر انیس کی شاعرانہ جہتوں کو بالتفصیل ادبی حلقوں سے روشناس کرایا ہے۔ انھوں نے انیس شناسی کے باب میں موازنۂ انیس و دبیر کی ترتیب و مقدمہ، انیس شناسی، اور گرانقدر تحقیقی مقالہ انیس شخصیت اور فن منظر عام پر لاکر انیس کے قدردانوں، مداحوں

اور انیسؔ شناسوں میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ یہ مقالہ پہلی بار ۱۹۸۲ء میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا اور اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ اکادمی ایڈیشن میں عربی و فارسی زبانوں میں کی گئی مرثیہ نگاری کا بالاستعیاب جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں عربی وفارسی مرثیہ نگاری، اردو مرثیہ انیسؔ سے قبل، تلامذۂ انیسؔ، انیسؔ کی شخصیت، مرثیہ نگاری، رباعی نگاری سلام وقطعہ نگاری کا تنقیدی جائزہ نہایت موثر اور مدلل انداز میں لیا گیا ہے۔

انیسؔ کی مرثیہ نگاری کے بارے میں پروفیسر فضل امام رضوی رقم طراز ہیں :

> ''اردو شاعری کی طویل تاریخ اور روایت میں میر انیسؔ کی شخصیت اور فن کسی تعارف کا محتاج نہیں کیونکہ انیسؔ نے اپنے فکر و فن کی وسعتوں سے اردو مرثیہ نگاری کو ہی توانا اور موثر نہیں بنایا ہے بلکہ اردو شاعری کو با آبرو بنا دیا۔ دراصل ایک عظیم شاعر و فنکار کسی موضوع، صنف یا ہئیت کا رہینِ منت نہیں ہوتا بلکہ وہ جس طرف بھی توجہ کرتا ہے اپنی منفرد فکر اور عظمتِ فن سے اسے لازوال بنا دیتا ہے۔
>
> (حرفِ آغاز، انیسؔ: شخصیت اور فن ص: ۷)

پروفیسر فضل امام ضوی اردو کے ان ناقدین میں ہیں جو عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت زبان و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت محض مرثیہ تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے راجستھانی زبان وادب، بھوجپوری ادب کا تعارف، جدید ہندی شاعری سمت و رفتار کے علاوہ اردو تنقید میں نئی فکر و آ گہی پر بھی عالمانہ نظر ڈالی ہے۔ وہ تنقید اور تنقید نگار کے منصب سے کماحقہٗ واقف ہیں کیونکہ تنقید ایک نازک فن

ہے اور یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ان کے تنقیدی نظریات سماجی بصیرتوں کے غماز ہیں۔ اس لئے ان کو سماجی تنقید نگار کی حیثیت سے سمجھا اور جانا جاتا ہے۔ پروفیسر فضل امام تنقید کی ماہیت اور فن پر ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں :

> ''کوئی بھی تنقید اس وقت تک معتبر نہیں ہو سکتی جب تک نقاد تخلیقی عمل سے بخوبی واقف نہ ہو۔ تخلیقیت ہی انتقادی شعور عطا کرتی ہے۔ دراصل ایک اچھا تخلیق کار ایک اچھی تنقید کی نشاندہی کرتا ہے۔''
>
> (افکار و نظریات مجموعۂ مضامین)

اردو تنقید کی بے بضاعتی رہی ہے کہ انیسؔ فہمی کے ضمن میں زیادہ تلاش و جستجو سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ پروفیسر فضل امام رضوی نے تفہیم انیسؔ کا جو گرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے اس کے متعلق اردو کے ممتاز و معتبر نقاد پروفیسر محمد حسن ان الفاظ میں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

> ''اردو تنقید نے ہنوز انیسؔ کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی تازہ تصنیف میں انیسؔ کے فن کا نئے زاویے سے مطالعہ کیا ہے ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔ تعصبات اور تاثرات کو صرف رائے زنی کے طور پر رنگین جملوں اور چیٹ پٹے فقروں میں بیان کرنے کے بجائے وہ سنجیدہ مطالعے کے عادی ہیں اور اپنے خیالات کو دلیل اور ثبوت سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ انیسؔ کے وکیل نہیں بلکہ ایک باذوق قاری اور ایک ذمہ دار نقاد کی طرح انیسؔ کا مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے

کے نتائج وضاحت اور صراحت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔''

(انیس شخصیت اور فن)

نقاد کے لئے وسعت مطالعہ ازحد لازمی ہے۔ پروفیسر فضل امام ان ناقدین میں ہیں جنھوں نے ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، راجستھانی، بھوجپوری زبان وادب کے تعلق سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ راجستھانی لوک گیت، راجستھانی لوک گاتھائیں جن پر عام طور سے اردو کے ناقدین کی توجہ نہیں ہوتی، اس موضوع پر ان کے فکر انگیز مقالے لائق تحسین ہیں۔ بھوجپوری ادبیات کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے لسانی ادراک سے کام لے کر زبان کی تعمیر وتشکیل کے سلسلہ میں انتہائی بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ علامہ اقبال کی اساسِ فکر پر بھی ان کی غائر نظر ہے اور اس موضوع پر ان کی ایک تصنیف بھی منصہ شہود پر آچکی ہے جس میں رموزِ خودی اور اسرارِ بےخودی کو بنیاد بنا کر انتہائی معلومات افزا انکشافات کئے ہیں۔

انیس شناس کی حیثیت سے پروفیسر فضل امام رضوی کے بارے میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ مراثی انیس کا غیر جانبدارانہ جائزہ جس منفرد انداز میں سے انھوں نے پیش کیا ہے وہ دیگر ناقدین کے یہاں کم کم نظر آتا ہے۔ ''انیس شخصیت اور فن'' ان کی وہ تصنیف ہے جس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر انیس کے فکر وفن پر کام کرنے والا کوئی بھی شخص اس تصنیف سے بے نیازانہ نہیں گذر سکتا۔ اس تصنیف سے استفادہ نہ کرنا اس کے لئے ناگزیر ہوگا۔

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
۶۸۔ چودھری محلہ کاکوری، لکھنؤ

ڈاکٹر ریحان حسن

پروفیسر فضل امام معتقد مولانا ابوالکلام

پروفیسر فضل امام کا شمار ہمارے ان علمائے ادب میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ادب کو کئی جہتوں سے مالا مال کیا ہے آپ بیک وقت مستند شاعر، بلند وقد آور نقاد، مایۂ ناز محقق، بے عدیل مبصر، معزز استاد اور ایک اچھے انسان ہیں، گویا وہ ایسی نادر شخصیت ہیں جن کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ کوزے میں سمندر کو قید کرنے کے مترادف ہے اس لئے ہم ان کی مجموعی ادبی خدمات کا احاطہ تو نہیں کر سکتے۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک معتقد کی حیثیت سے اس مختصر مقالے میں ان کے فکر وفن سے بحث کی جا سکتی ہے۔

بلا شبہ مولانا ابوالکلام آزاد نادر روزگار شخصیت تھے وہ ایسے زمانہ میں تھے جبکہ ملک پر پیمبری وقت آپڑا تھا۔ لہٰذا مولانا نے ملک وقوم کے لئے پوری زندگی تج دی مولانا ابوالکلام آزاد کن دشوار ترین منزل سے گذر رہے تھے اس کی وضاحت پروفیسر فضل امام یوں کرتے ہیں۔

> ''وہ تاریخ کے اس دوراہے پر کھڑے تھے جہاں سے کسی ایک راستے کو اپنا لینا انتہائی دشوار گذار تھا مگر وہ بے خوف وخطر اس راستے پر گامزن ہو گئے جو ان کی آزادیٔ ضمیر کے جوہر کو انمول بنانے والا تھا۔ مولانا کے لئے یہ دور انتہائی نازک تھا جس راستے پر وہ

گامزن ہوئے وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک تھا دو
انتہاؤں کے درمیان ان کا وجود علم وعمل کو حوصلہ بخشتا رہا۔"
(تنقیدی معیار، مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت ص:۴۳)

مولانا نے ملک وقوم کی متعدد طریقوں سے رہنمائی کی اور وہ ہر منزل میں کامیاب وکامران بھی ہوئے اوراس طرح ان کی شخصیت کا زاویہ، زاویۂ مثلث قرار پایا جیسا کہ پروفیسر فضل امام نے کہا ہے۔

"ان کی شخصیت ایک طرح کا مثلث ہے جو سیاست
ادب اور مذہب کے زاویوں میں جلوہ گر ہوتی ہے (ایضاً ص:۴۳)

مولانا ابوالکلام نے سیاست کے میدان میں بھی ایسا قدم جمایا کہ ان کے پائے ثبات میں اس وقت بھی لغزش پیدا نہ ہو سکی جب کہ ان کو نا قابل بیان کیفیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے عزم وہمت کو دیکھ کر ان کے دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی ان کی فکری بصیرت اور ذہنی جودت کے قائل ہو گئے اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام کرنا یا کوئی جلسہ منعقد ہونا ناممکن سا ہو گیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ بقول پروفیسر فضل امام "ان کی گرفت میں ماضی اور حال ہی نہیں مستقبل بھی تھا۔ وہ بہت دور سے تاریخ کے قدموں کی آہٹ جان لیتے تھے اور اس آہٹ میں چھپے ہوئے طوفانوں کو پہچان لیتے تھے۔" (ایضاً ص ۴۷)

اس طرح پروفیسر فضل امام نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت سوجھ بوجھ اور ان کے ذریعے کئے گئے تاریخی فیصلے کے وہ تمام سیاق وسباق قاری کے سامنے روز روشن کے مثل عیاں ہو جاتے ہیں کہ جس پس منظر کی بدولت ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی اور وہ اس لائق ہو سکے تھے کہ ملک وقوم کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔

پروفیسر فضل امام نے مولانا ابوالکلام کے سیاسی نظریات پر بہت ہی مدلل

اور تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مولانا کی زندگی کے اہم رُخ صحافت و ادب پر بھی کما حقہ روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ باور کرایا ہے کہ انھوں نے اپنی جولانی قلم کے ذریعے صحافت و ادب کو جو بیش قیمت تحائف عطا کیے ہیں اس کے لئے ادبی دنیا ہمیشہ گراں بار رہے گی۔ مولانا کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں۔

''وہ صحافت جس کو انھوں نے اپنی جولانی قلم سے ادبیت عطا کر دی اور جب دنیائے فصاحت کے مطلع عالم تاب پر ان کی بلاغت کے شب و روز ''الہلال'' بن کر نمودار ہونے لگے تو اس کا ''تذکرہ'' بڑی آزادی سے ہونے لگا اور ان کے قلم کی ''البلالی'' تنویریں ''لسان الصدق'' بن کر قرآن حکیم کی ترجمانی کرنے لگیں۔ انھیں جب قید خانہ کی اندھیری کوٹھری میں نور سحر ملا تو ''غبارِ خاطر'' کے روپ میں قندیل ادب نگاہوں کو نگار خانۂ انانیت کے جلوۂ صد رنگ دکھانے لگی۔ مولانا نے شاعری بھی کی اور ''محبِّ جمال'' بھی رہے مگر وہ جلد ہی ''جمال مستی'' سے نکل کر ''جلال عشق مستی'' کے ترجمان بن کر ''کمال عشق مستی'' کے گرویدہ بن گئے۔ انھوں نے اپنے رشحات قلم سے حریم قوم و وطن کے افسانوں پر شعر و ادب کے صنم سجا دیئے اور شعر و شریعت کے تضادات کو ایسا ہم رنگ کر دیا کہ ان کے ادبی سبو میں جہاں شراب حافظ شیراز کے مطہر قطرات ہیں وہیں غزالی کے تلقینی افکار بھی۔'' ایضاً ص:۴۹

ڈاکٹر فضل امام نے ان چند سطور میں مولانا ابوالکلام کی صحافت اور ادبی قدر و قیمت کو اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ مولانا کی ادبی خدمات نظروں کے سامنے آ گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فضل امام کی قلمی پختگی اور ادائے خطابت پر جو گرفت حاصل ہے اس کا بھی اندازہ کس حد تک ہو جاتا ہے جسکے ثبوت میں یہ تراشہ بھی دیکھیں:

> ''مولانا آزاد کے طرز نگارش کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ ان کی پوری شخصیت اس میں جھلکتی ہے۔ ان کے علم کی وسعت اور ہمہ گیری ہر جملے میں نظر آتی ہے۔ ترکی، عربی، فارسی، اور اردو کے مستند شعراء کا شعری مزاج اور ان کا ادبی ضمیر، مولانا کی تحریروں میں رچا بسا ہوا ہے اور اس پر مستزاد ان کی انانیت کا پرتو ہے۔ اس لئے ان کی تحریریں عشق وجنون کا حسین امتزاج بن گئی ہیں۔'' (ایضاً ۵۰)

مولانا ابوالکلام آزاد کی مذہبی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ دراصل مولانا کی نظر میں انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب تھا۔ اس لئے انھوں نے تمام ادیان کو بہتر اور یکساں تسلیم کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر بھی اس انداز سے تحریر کی کہ اتحاد و اتفاق اور بقائے باہم کا جذبہ بیدار ہو۔ انھوں نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعے صرف مسلمانوں کو مخاطب نہیں کیا بلکہ تمام انسانوں سے خطاب کیا جیسا کہ پروفیسر امام ان کی مذہبی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''مولانا کے مذہبی انداز نظر میں صرف مسلمان ہی نہیں رہے بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو وہ اپنا مخاطب قرار دیتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ان کی تفسیر، تفسیر بالرائے بھی بن جاتی ہے جس سے اختلاف کے باوجود ہندوستان کی تاریخ کے پس منظر اور طویل تناظر میں یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ایسا مولانا نے اتحاد و اتفاق کے لئے کیا ہوگا جو دینی تعلیمات اور مذہبی احکامات کی روح ہے۔'' (ایضاً ۵۳)

پروفیسر فضل امام ابوالکلام آزاد کے پیغام اتحاد سے بہت ہی متاثر ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ''نظریہ وحدت ادیان'' کی متعدد طریقوں سے تعبیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مولانا کے ان خیالات کو تقویت پہنچانے کیلئے اپنے مجموعہ ''تنقیدی معیار'' میں اپنے ایک مضمون کا عنوان ہی ''مولانا ابوالکلام آزاد اور نظریہ وحدت ادیان'' قائم کیا

ہے اور یہ باور کرانے کی سعی مشکور کی ہے کہ دراصل۔

> ''وہ کٹر پن اور تنگ نظری کو روح اسلام کے منافی سمجھتے تھے اور وہ مذہب کی اصل روح انسان دوستی اور امداد باہمی گردانتے ہیں چاہے جو بھی طریقۂ عبادت ہو وہ منزل حق تک پہنچا دیتا ہے۔''
>
> (مولانا ابوالکلام آزاد اور نظریۂ وحدت ادیان،تنقیدی معیار ص:۵۷)

مولانا کے ان خیالات کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر فضل امام نے بتایا ہے کہ دراصل مولانا نے اپنے ان افکار کے ذریعے قومی یکجہتی کا پیغام اس لئے بھی دیا۔ کیونکہ ''وہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والوں میں اتحاد و یگانگت چاہتے ہیں۔'' (ایضاً ص:۵۸)

یہ اظہر من الشمس ہے کہ قومی یکجہتی کے بغیر ہندوستان کے لوگوں کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نجات نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے مولانا اتحاد و اتفاق کو قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے لئے قرآن کی تفسیر اس طرح بیان کی کہ مسلمانوں کو یہ یقین ہو کہ اتحاد و یگانگت کی تعلیم وہ دراصل ازروئے قرآن و اسلام دے رہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام کے اس طریقۂ کار کی ڈاکٹر فضل امام وضاحت اس طرح کرتے ہیں:۔

> ''مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی قدر دین اور سیاست کے حسین امتزاج کا ایک پیکر تھی اور ان کا ''نظریۂ وحدت ادیان'' بھی جہاں ایک طرف دین کے اساسی پہلوؤں کا امانت دار تھا، وہیں دوسری طرف سیاسی اغراض و مقاصد کا آئینہ دار بھی اور ظاہر ہے کہ دین اور سیاست کو جدا بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔''
>
> (ایضاً ص:۶۷)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بخوبی واضح ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام کے تفکرات وتخیلات سے بہت حد تک متفق ہیں اور وہ ان کے تفکرات کے ذریعے ملک و قوم میں اتحاد واتفاق دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

پروفیسر فضل امام کی ان تحریروں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے مقالات کے لئے مواد اور حقائق کو پوری محنت ولگن سے پہلے جمع کرتے ہیں اور انتہائی تفکر وتدبر کے بعد اپنے نتائج کو صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں اور اس طرح اپنے قارئین کو نئے نکات اور انفرادی خصوصیتوں سے متعارف کراتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ''تنقیدی معیار'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے متعلق مضامین میں مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے قاری کو روشناس کراتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ مولانا ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے تفکرات وتخیلات سے محض صحافت، ادب اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اکتساب نہ کریں بلکہ ان کے ارشادات واقوال سے ہمارے ملک کے تمام مکتبۂ فکر کے افراد مستفیض ہو سکتے ہیں۔ خواہ ان کے الہلال والبلاغ میں شائع شدہ مضامین ہوں یا غبار خاطر کے مکاتیب ان کے تمام مقالات ومکاتیب اور تقریروں میں ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں کے لئے ایسا ابدی پیغام ہے جس سے انسانوں کو صحیح راستہ مل سکتا ہے۔ لہٰذا ان کے بتائے ہوئے راستے کو مشعل راہ بنانے کی ضرورت ہے تاکہ سرمایۂ حیات حاصل ہو جائے۔

پروفیسر فضل امام کے ان مضامین کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابوالکلام آزاد کی تحریر وتقریر کے مداح ہی نہیں بلکہ ان کی انوکھی شخصیت کے معترف اور معتقد بھی ہیں۔

خوشتر مکرانوی

ڈاکٹر فضل امام
مستند ناقدین کی نظر میں

◉ ''آپ کی گراں قدر تصنیف ''امیر اللہ تسلیم..... حیات اور شاعری'' پڑھی آپ بہت جم کر اور ڈٹ کر کام کر رہے ہیں۔ آپ بہت کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے مضامین میں ہندی اور راجستھانی سے متعلق کئی چیز اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔''

☆..........................ڈاکٹر گیان چند جین

پروفیسر وصدر شعبۂ اُردو

سنٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد۔

◉ ''ڈاکٹر فضل امام نے ''امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر کے بہت بڑی کمی پوری کی ہے ان کا اندازِ تحقیق وتنقید معتبر اور دل نشین ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔''

☆..........................مشفق خواجہ

ناظم آباد، کراچی

◉ ''میری نظر سے ڈاکٹر فضل امام کی اب تک کی سبھی مطبوعہ کتابیں گزری ہیں۔ جو اُن کی لگن، علمی ذوق وشوق اور اچھی صلاحیتوں کے نشان دہی کرتی ہیں لیکن یہ تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام تصانیف میں ''امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری'' کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو ادب میں اہم اضافہ ہے''

☆............... پروفیسر عبدالقوی دسنوی

صدر شعبۂ اُردو

سیفیہ کالج، بھوپال

◉ ''ڈاکٹر فضل امام داد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے بھوج پوری زبان کی تاریخ لکھنے میں پہل کی اور اُردو والوں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ اُمید ہے کہ ان کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔''

☆............... ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

ماہنامہ ''شاعر'' اگست، ستمبر ۱۹۷۶ء

◉ ''کتاب میں ایسے نشانات واضح ہیں جن سے ڈاکٹر فضل امام کی خوبی استعداد خود اعتمادی اور جرأتِ اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر (امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری) کے صفحہ ۹۶ پر، پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسے مقتدر اور مستند ناقد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے نظریے کی تائید میں ڈاکٹر فضل امام نے جو دلائل و براہین پیش کیے ہیں اس سے نہ صرف مطالعہ کی وسعت کا پتا چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے نتائج فکر پر اعتماد ہے۔ یہ اعتماد اور جرأت بہت اہم ہے۔''

☆............... پروفیسر محمد انصار اللہ

اُستاد، شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ماہنامہ ''تحریک'' دہلی، مئی ۱۹۷۷ء

◉ ''ڈاکٹر فضل امام نے ''بھوج پوری ادب کا تعارف'' کا مواد فراہم کرنے میں محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ کافی مطالعہ کیا ہے زبان کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھی ہے اور موضوع کے لحاظ سے کتاب کی ترتیب کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بھوج پوری زبان کی معلومات کے ساتھ اُردوداں طبقہ میں لسانی ربط پیدا ہوگا۔ یہ نقوش دوسرے اہلِ قلم کے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔''

☆......................ڈاکٹر سیفی پریمی

ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، جنوری ۱۹۷۵ء

◉ ''ڈاکٹر فضل امام اُردو کے نوجوان محقق اور استاد ہیں۔ ''مثنوی خنجرِ عشق'' تسلیم کی مثنوی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس مثنوی کو ایڈٹ کر کے معینہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے مگر بے جا طوالت سے پاک ہے۔ مقدمہ میں مثنوی کی مختصر تاریخ اور خصوصیات کے علاوہ، امیر اللہ تسلیم کی غیر مطبوعہ اور مطبوعہ مثنویوں کا تعارف کرا کر بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کی کاوش قابلِ تحسین ہے جن کی سعئ جمیل سے اُردو کی یہ غیر مطبوعہ مثنوی شائع ہوگئی۔''

☆......................ڈاکٹر عنوان چشتی،

پروفیسر شعبۂ اُردو

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، شمارہ اکتوبر ۱۹۷۴ء

◉ ''ڈاکٹر فضل امام صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کیونکہ اگر وہ مثنوی ''خنجر عشق'' شایع نہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ یہ مثنوی بھی دست بردِ زمانہ کی نذر

ہوجاتی اور ہم اپنے ایک قیمتی ادبی ورثے سے محروم ہوجاتے۔ ڈاکٹر فضل امام نے بڑی محنت وکاوش اور جاں فشانی سے اسے مرتب کیا ہے۔"

☆..................ڈاکٹر خلیق انجم

مدیر ہفتہ وار "ہماری زبان" دہلی، اشاعت یکم ستمبر ۱۹۷۴ء

◉ "بھوج پوری، اُردو کے لیے بالکل اجنبی زبان نہیں رہی، لیکن اُردو اور اُردو کے مشترکہ تہذیبی مزاج سے قربت کے باوجود، اُردو میں بھوج پوری ادب کے بارے میں کوئی معلوماتی رسالہ یا کتاب دستیاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی مختصر تصنیف کے ذریعہ اس کمی کو بڑی حد تک دور کیا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام نے جدید سائنٹفک انداز سے اس مختصر تعارف کو اس طرح تشکیل دیا ہے کہ بھوج پوری زبان وادب کی ایک اجمالی تصویر ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ اُردو والوں اور اُردو کے طالب علموں کے لیے یہ ایک ایسا اہم کارنامہ ہے، جسے دیکھ کر یہ آرزو ہوتی ہے کہ کاش اُردو میں، ہندوستان کی دیگر زبانوں کے بارے میں بھی اس طرز کی تعارفی اور معلوماتی تصانیف میسر آسکیں۔"

☆..................محمود ہاشمی

ہفتہ وار "ہماری زبان" دہلی، شمارہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء

◉ "مشرقی اُترپردیش میں اعظم گڑھ کو ہمیشہ سے مرکزیت حاصل رہی ہے یہاں کی سرزمین بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے۔ مولانا حمیدالدین فراہیؔ، علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، اقبال سہیلؔ، شاہ معین الدین ندوی، فاروق چریاکوٹی، مولانا سید محمد رضا قبلہ، پروفیسر سید احتشام حسین رضوی، علی جواد زیدی، شمیمؔ کرہانی، کیفیؔ اعظمی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ وغیرہ جیسی مقتدر علمی وادبی

ہستیاں اسی سرزمین سے اُٹھیں اور بساطِ علم وادب پر چھا گئیں...... انتہائی مسرت ہے کہ ڈاکٹر فضل امام بھی سرزمین اعظم گڑھ کی علمی وادبی روایات کے امین اور ترجمان ہیں.... اُردو کے نوجوان محققین اور ناقدین میں انھوں نے اپنا نمایاں اور قابل رشک مقام بنا لیا ہے۔ ''افکار و نظریات'' ڈاکٹر فضل امام کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ان کا منطقی استدلال، علمی تفحص، تحقیقی ریاضت، تاریخی حقیقت، اور تنقیدی وزن و وقار شامل ہے۔ وہ ادب پارے کو فن کی کسوٹی پر، پرکھ کر دوٹوک رائے ظاہر کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے ہیں اور یہی ان کے قلم سے نکلی ہوئی نگارشات کی بنیادی خصوصیت ہے۔''

☆............امیر احمد صدیقی

ایڈیٹر نیا دور، لکھنؤ، شمارہ مارچ ۱۹۷۸ء

◉ ڈاکٹر فضل امام ہمارے اُن معتبر محققین و ناقدین میں ہیں جن کے قلم میں بڑا وازن و وقار ملتا ہے چنانچہ راجستھانی زبان وادب کے بارے میں بھی انھوں نے ہم اُردو والوں کی بے علمی کو علم میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

جزاک اللہ۔

☆............پروفیسر جگن ناتھ آزاد

صدر شعبۂ اُردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈین فیکلٹی آف آرٹس،

◉ اردو تنقید نے ہنوز انیسؔ کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی تازہ تصنیف میں انیسؔ کے فن کا نئے زاویے سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے تعصبات اور تاثرات کو صرف رائے زنی کے طور پر رنگین جملوں اور چٹ پٹے فقروں

میں بیان کرنے کے بجائے وہ سنجیدہ مطالعے کے عادی ہیں اور اپنے خیالات کو دلیل اور ثبوت سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں، وہ انیسؔ کے وکیل نہیں بلکہ ایک باذوق قاری اور ایک ذمہ دار نقاد کی طرح انیسؔ کا مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے کے نتائج وضاحت اور صراحت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

☆.....................ڈاکٹر محمد حسن

◉ زیرِ نظر مقالہ ڈاکٹر فضل امام کے خوشگوار تنقیدی شعور و اسلوب کا حامل ہے۔ انھوں نے میر انیسؔ کی فنکاری کا جائزہ نہایت جامع سیاق و سباق میں لیا ہے اور نہ صرف اس کے معنوی نہاں خانے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے بلکہ لفظیات کے بیرونی نگارخانے پر بھی باخبری کی نگاہ ڈالی ہے۔ پردۂ ساز کا کہرام، شمشیر کی جھنکار، دامنِ صحرا پر موتیوں کی لرزش، پرطاوس کی قلم کاری، خونِ شہدا کی شفق، مرثیت کا آب زُلال، اور پھر تاریخ و روایت کا انتہائی پیچیدہ سلسلۂ خیر و شر، میر انیس کی فنکاری کے بنیادی اور علامتی اجزا سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام نے ان سب ہی نکات پر بصیرت خیز نظر ڈالی ہے۔ اور انیسیات کے سرمایہ میں ایسی توسیع کی ہے جو قابلِ دید و داد ہے۔

☆.....................ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی

◉ ڈاکٹر فضل امام کے تحقیقی و تنقیدی کاموں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ در اصل یہ ہمارے ان نوجوانوں میں ہیں جنہوں نے تحقیق و تنقید کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ انھوں نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا ہے اس میں پوری طرح ڈوب کر اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کا یہ مقالہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

☆.....................پروفیسر جگن ناتھ آزاد

◉ ڈاکٹر فضل امام کا یہ کام، میر انیسؔ کے مطالعے میں بہت سے تشنہ حصوں کو مکمل کرتا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نئی نسل کے اچھے نقادوں میں ہیں۔ ان کا تجزیہ اور ان کی تفہیم انیس، میر انیس کو سمجھنے میں خاصی مدد کرتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب، انیس شناسی کے لیے ایک اہم ذریعہ بن جاتی ہے

☆.................ڈاکٹر سید محمد عقیل

◉ ڈاکٹر فضل امام نے اردو تنقید کے سرمایہ میں اہم اضافے کیے ہیں۔ ان کی نئی تصنیف ''انیسؔ: شخصیت اور فن'' میں انیسؔ کے بعض اہم گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور انیسؔ کے شعری جمالیات کے اس جادو کو تلاش کرنے کی سعی بلیغ بھی کی ہے جس کو انیسؔ کا اسلوب کہا جاتا ہے۔

☆.....................ڈاکٹر عنوان چشتی

❀❀❀

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ڈاکٹر فضل امام کے علمی وادبی کارنامے

ڈاکٹر فضل امام کے علمی اور ادبی کارناموں پر رشک آتا ہے۔ رشک اس لیے کہ ایک طرف وہ اپنے شعبۂ اُردو فارسی کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہیں اور دوسری طرف اپنے تخلیقی کاموں سے بھی غافل نہیں۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر توجہ شعبے کی تعمیر و ترقی کو دی جائے تو اپنا لکھنے پڑھنے کا کام پسِ پشت چلا جاتا ہے اور اگر اپنا تخلیقی کام پیشِ نظر ہو تو شعبہ ترقی نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی میں میرے چار برس اس طرح گزرے ہیں کہ شعبے میں تو سمیناروں، ٹاکس، توسیعی لکچروں اور سمر انسٹی ٹیوٹ وغیرہ کی بھرمار رہی، ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان سے اکثر مقررین ہمارے شعبے میں آکر اپنے خیالات سے ہم لوگوں کو مستفید کرتے رہے لیکن میرا اپنا لکھنے پڑھنے کا کام قریب قریب ختم ہو گیا لیکن ڈاکٹر فضل امام نے اس ضمن میں ایک معجزہ دکھایا ہے۔ اپنی توجہ شعبے کے کاموں اور اپنے تخلیقی کاموں میں اس طرح تقسیم کی ہے کہ دونوں میں سے کسی کا نقصان نہیں ہونے پایا۔

جہاں تک ڈاکٹر فضل امام کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعلق ہے اس کا بھرپور اظہار اُن کے متعدد مقالات اور تصانیف میں بڑی کامیابی کے ساتھ ہوا ہے۔ ''افکار ونظریات''

تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ایک معتبر تصنیف ہے۔ اس میں بعض ایسے موضاعات بھی شامل ہیں جو ہمارے اکثر نقادوں کے لیے حلقۂ بیرونِ در کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً ''اُردو زبان پر ہندو تہذیب اور مذہب کے اثرات''، ''ہندی شاعری میں تلسی داس کا مقام''، ''ہندی شاعری میں جدید رُجحانات''، ''تلسی داس آئینۂ روایات میں''۔ جب یہ مضامین میری نظر سے گزرے تو مجھے اپنے اُستادِ محترم شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی کا یہ قول یاد آ گیا کہ اُردو جب تک ہندوؤں میں مقبول نہ ہوگی، ہندوستان میں اس کے قدم نہیں جم سکیں گے۔ یہ بات مولانا نے تقسیم ہند سے بہت پہلے کہی تھی اور یہ آج بھی اتنی ہی صحیح ہے۔ جتنی اُس زمانے میں تھی لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو ہندوستان میں مقبول کیسے ہو؟ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان موضوعات پر قلم اُٹھایا جائے جنھیں ہندو اپنے دل سے قریب سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس راز کو پالیا ہے اور مذکورہ بالا موضوعات پر قلم اُٹھا کر انھوں نے اُردو کی صحیح معنوں میں خدمت انجام دی ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میری نظم و نثر اس طرح کے موضوعات سے عاری ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ میری نظم و نثر کی خامی ہے، اور جب کسی اہلِ قلم کے یہاں ایسے موضوعات نظر آتے ہیں تو میں ان کی کاوش کو قابلِ مبارکباد سمجھتا ہوں، خواہ وہ کاوش میرا جی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی ہو خواہ فراقؔ گورکھپوری اور ڈاکٹر فضل امام کی۔

ہمارے یہاں ہر علاقے اور ہر ریاست کی اپنی زبان ہے اور اپنا ادب ہے۔ ان تمام زبانوں کی ادبی تخلیقات اپنی جگہ پر بھی ہندوستانی ادب ہیں اور ہندوستانی ادب کی تعمیر و تشکیل میں کوشاں بھی ہیں..... لیکن اگر میں تمل، تیلگو، مراٹھی یا راجستھانی ادب سے قطعاً بے بہرہ رہوں گا تو ہندوستانی ادب کی مکمل تصویر میرے

سامنے کس طرح آئے گی اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ دوسرے علاقوں کے ادب سے میری واقفیت ہو، لیکن یہ واقفیت کیسے ہو؟ اُن دو ایک زبانوں کے علاوہ جو اس وقت تک میں جانتا ہوں اور کتنی زبانیں اپنے ملک کی سیکھ سکتا ہوں؟ اس مسئلے پر بھی ڈاکٹر فضل امام کی نظر گئی ہے اور دوسرے علاقوں کی زبانوں اور ادب سے اُردو والوں کو آشنا کرنے کے لیے انھوں نے دو اہم کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام ہے...... ''بھوج پوری ادب کا تعارف'' ......اور دوسری کا نام ہے ..... ''راجستھانی زبان و ادب کا تعارف'' .....میں ڈاکٹر فضل امام کی اس کاوش کو اردو ادب کے لیے نیک فال سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اُردو دُنیا اس طرح کی مساعیٔ جمیلہ کو خوش آمدید کہے گی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
سابق صدر شعبۂ اُردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس،
جموں یونیورسٹی، جموں۔

ڈاکٹر رضوان انصاری

پروفیسر سید فضل امام رضوی بحیثیت ناقد

اردو ادب میں ''تنقید'' کی اصطلاح براہِ راست عربی زبان و ادب کے لفظ ''نقد'' سے مشتق ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ عرب کے شعراء دورِ جاہلیت میں سال کے ایک مخصوص دن عکاظ کے میدان میں یکجا ہوتے اور اپنا ایک معتبر صاحب علم، اور مبصر کو حکم مقرر کر کے یکے بعد دیگرے اپنا اپنا معیاری کلام پیش کرتے تھے۔ پھر ان کے کلام کے محاسن و معائب پر رائے زنی ہوتی۔ ان میں سے جس کا کلام بہر معانی خوب سے خوب تر قرار پاتا اسے خانۂ کعبہ کے عین دروازہ پر معلق کر دیا جاتا تھا، جس کا مقصد یہ ہوتا کہ یہ اس شاعر کا کلام ہے، جو سب سے بڑا ہے اور ہر آنے والا اس کلام کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا۔ اس طرح عرب کے سات نامور شعراء کے کلام کو ''سبع معلقہ'' کے نام سے شہرت ملی۔ جو ہر طرح شعری محاسن سے بھرپور تھے۔ اس کے علاوہ تنقیدی شعور کا پتا ایک مزید واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں امراء القیس اور علقمہ کے مابین ایک حکم متعین کر کے شعری مباحثہ ہوا جس میں دونوں کے کلام کا معنوی اور صوری اعتبار سے جائزہ لیا گیا تھا۔

تنقید کا یہ تصور ہمارے ادب میں گو کہ آغاز شعر و نغمہ سے ملتا ہے۔ اس کی ابتدائی فکر بیاضوں اور اردو شعراء کے سوانحی خاکوں پر مبنی تاریخ ادب میں ملتی ہے مگر

اسے تنقید کے زمرے میں شامل کرنا مناسب نہیں کیوں کہ وہ ذاتی رائے پر ہی ہوتے۔ اردو ادب میں حقیقی محور پر تنقید کا صحیح اور واضح نظریہ خواجہ حالی پانی پتی (ولادت ۱۸۳۷ء وصال ۱۹۱۱ء) کی کتاب مقدمہ شعروشاعری سے ملتا ہے۔ مولانا حالی کو یہ شعور عربی وفارسی زبان وادب کے گہرے مطالعہ کے بعد حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی فکر کو جلا اُس وقت ملی جب وہ انگریزی ادب کی کتابوں کا اردو ترجمہ درست کرنے پر مامور کیے گئے۔ گویا مغربی اور مشرقی فکروشعور کے امتزاج نے انھیں اپنی شاعری پر نہایت بسیط مقدمہ تحریر کرنے پر مجبور کیا، جو بعد میں اردو تنقید کی اہم تخلیق قرار پائی جسے دانشورانِ علم وادب نے اردو تنقید کی خشت اوّل گردانا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے جو شمع ادب روشن کی اُس سے مابعد کے تشنگانِ علم وفن اپنے ذہن وفکر کو منور کرتے رہیں گے۔ مولانا حالی کی فکری اساس اور سرچشمے سے سیراب اور مستفیض ہونے والوں کی فہرست طویل ہے۔ مگر عصر حاضر میں اردو کے جن دانشوروں نے ان کے فکر شعور کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں پروفیسر سید فضل امام رضوی کا اسم گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

پروفیسر سید فضل امام رضوی اردو زبان وادب کے بالغ فکروشعور کے حامل دانشور ہیں۔ ان کی نظر اردو کے قدیم وجدید ادب پر بہت گہری ہے۔ وہ انگریزی زبان وادب کے ساتھ ساتھ ہندی، عربی اور فارسی ادب پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا قلم بہت خاموشی سے ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔ وہ اخباری شہرت اور ناموری سے ماوراء رہنا پسند کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں تقریباً ڈیڑھ درجن علمی و ادبی شاہکار تخلیقات شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن کی قدروقیمت کا تجزیہ کرکے دانشورانِ ادب نے خوب خوب ستائش کی ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی ۷/اگست ۱۹۴۰ء کو موضع بہاء الدین پور، اعظم گڑھ میں آب و گل کے منازل طے کر کے عالم رنگ و بو میں جلوہ گر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دستورِ زمانہ کے مطابق مکتب سے شروع کی۔ پھر ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات پاس کر کے گورکھپور اور آگرہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔ حصول علم کا ذوق روزِ ازل میں قدرت نے بڑی فیاضی سے عطا فرمایا تھا اس لیے برابر علم و ادب کے حصول میں منہمک رہے۔ چناں چہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ منبع علم و فن پروفیسر محمود الٰہی سابق صدر شعبہ اردو گورکھپور یونی ورسٹی کے روبرو زانوئے ادب تہہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا اور ان کی سربراہی میں اردو کی اعلیٰ ترین اسناد یعنی Ph.D اور D.Lit. بھی حاصل کر لیں۔

پروفیسر محمود الٰہی اپنے اسکالر کو ظاہری علوم سے آشنا ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی باطنی خوبیاں بھی اجاگر کرتے۔ انھوں نے فضل امام میں تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو سونا بنا کر اردو ادب کی خدمت کے لیے تیار فرمایا۔ حقیقت مسلمہ ہے کہ پروفیسر محمود الٰہی ایک کیمیا گر تھے۔ وہ جس معیار کے تحقیقی و تنقیدی شعور رکھتے ہیں اسی پر اپنے شاگردوں کو بھی چلنے کی ہدایت دیتے۔ چنانچہ فضل امام رضوی ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مصروف ہیں۔ یقیناً بلا مبالغہ وہ عصر حاضر میں عظیم ناقد اور محقق ہیں۔ ان کا رثائی ادب پر بھی بہت اہم کام ہے۔ انھیں سید مسعود حسن رضوی ادیب کا جانشین برحق کہا جائے تو درست ہوگا۔ اس مختصر مقالہ میں پروفیسر فضل امام کی تنقیدی بصیرت کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی نے ۱۹۷۲ء میں مہارانی کنور پی جی کالج بلرامپور سے تدریسی خدمت کا آغاز کیا۔ اس کے بعد جے پور (راجستھان) اور الہ آباد کی اعلیٰ دانشگاہوں میں تشنگانِ علم و ادب کے ذہن و فکر کو سیراب کرتے رہے۔ اب وہ تدریسی

دور سے گزر کر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اور نہایت سکون کے ساتھ اردو زبان و ادب کی عملی خدمت میں مصروف ہیں۔ پروفیسر موصوف کی درج ذیل کتب شایع شدہ میں سے چند یہ ہیں:-

۱۔ مثنوی خنجر عشق۔ تسلیم لکھنوی (ترتیب و مقدمہ) ۲۔ بھوجپوری ادب کا تعارف ۳۔ جدید ہندی شاعری ۴۔ امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری ۵۔ مثنوی گوہر انتخاب تسلیم (ترتیب و مقدمہ) ۶۔ راجستھانی زبان و ادب کا تعارف ۷۔ انیس شناسی ۸۔ موازنہ انیس و دبیر (ترتیب و مقدمہ) ۹۔ افکار و نظریات، ۱۰۔ دیوانِ درد کا نقشِ اوّل ۱۱۔ اردو ساہتیہ ایک جھلک اول، دوم (ہندی رسم الخط میں) ۱۲۔ انیس شخصیت اور فن ۔۱۳۔ علامہ اقبال کی فکر اساس ۱۴۔ امعانِ نظر ۱۵۔ مشرقی انتقادیات اصول و نظریات۔ وغیرہ

پروفیسر فضل امام رضوی پر مبنی زیر نظر مقالہ میں مشرقی انتقادیات اصول و نظریات، انیس شخصیت اور فن، انیس شناسی، اور امعانِ نظر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جس سے پروفیسر رضوی کی تنقیدی فکر و نظر پر سرسری روشنی پڑ سکے گی۔

پروفیسر فضل امام رضوی کا مطالعہ مشرقی ادب پر بہت عمیق ہے۔ وہ عربی ادب میں بھی کمالِ تامہ رکھتے ہیں۔ ان کی فکر میں بلوغیت ہے۔ بے جا تاویلات یا غیر ضروری باتوں سے سراسر احتراز کرتے ہیں۔ وہ کم سے کم جملوں یا لفظوں میں ماحصل پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ پروفیسر موصوف کی تنقید پر مبنی کتاب مشرقی انتقادیات اصول و نظریات ۱۹۹۱ء میں شایع ہو کر منظر عام پر آئی، جس میں کل ۹ رمقالات ہیں جو یوں ہیں:-

۱۔ دکنی مراثی کی تدریس کے مسائل ۲۔ سوزخوانی روایت اور آداب

۳۔عہد حاضر میں مرزا دبیر پر تحقیقی وتنقیدی کام کی سمت ورفتار

۴۔فراق کی تنقید نگاری ۵۔سنسکرت ناول نگاری ۶۔اردو مرثیوں میں نعت

۷۔سجاد حیدر یلدرم کی شاعری ۸۔تنقید اور اس کی ماہیت

۹۔ مشرقی تنقید، اصول ونظریات

متذکرہ کتاب سے متعلق تمام موضوعات مقالات کی شکل میں مختلف ادوار میں لکھے گئے تنقیدی خیالات پر مشتمل ہیں۔ اگر ان سب پر اظہار خیال کیا جائے تو مقالہ کافی طویل ہو جانے کا یقین غالب ہے۔ اس لیے چند ایک مقالات پر ہی نظر ڈالی جا سکے گی۔

فراق گورکھپوری کو شہرت اردو شاعری کی بدولت ملی۔ وہ بحیثیت شاعر کافی مقبول ہیں۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جو ''اندازے'' کے نام سے شایع ہوا۔ اسی مجموعہ مضامین کو مدنظر رکھ پروفیسر فضل امام رضوی نے تنقیدی جایزہ لینے کی کامیاب سعی کی ہے۔ آئیے چند اقتباسات سے حقیقت تک رسائی حاصل کی جائے پروفیسر فضل امام رقمطراز ہیں:

> ''فراق کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا تھا، لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے بلکہ تنقید کی دنیا میں بھی دخل دینا واجبات میں سمجھتے تھے۔ یہی نہیں وہ تخلیقی اور زندہ تنقید کے نقیب بھی بننا چاہتے تھے اور مختلف انداز سے اس پر مصر تھے کہ انھیں بحیثیت تنقید نگار تسلیم کیا جائے۔ اس کا وقتاً فوقتاً وہ تحریری اور تقریری طور پر اظہار اور اعلان بھی فرماتے ہیں۔''
>
> (مشرقی انتقادیات ص:۶۹)

پروفیسر موصوف اپنی بات کی شہادت میں فراقؔ جی کی تنقیدی کتاب ''اندازے'' کے پیش لفظ کا اقتباس تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

> ''ہاں تو میری غرض وغایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی تھی کہ جو جمالیاتی، وجدانی، اضطراری اور مجمل اثرات قدما کے کلام کے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں۔ انھیں دوسروں تک اس صورت بھی پہنچادوں کہ ان کے اثرات میں حرارت وتازگی قائم رہے۔ میں اس کو خلاقانہ تنقید یا زندہ تنقید کہتا ہوں۔'' (اندازے ص:۹)

پروفیسر فضل امام رضوی نے اس اقتباس سے کیا نتیجہ نکالا اور اسے فراقؔ گورکھپوری کی تنقید نگاری سے کس درجہ درست قرار دیا ہے۔ رائے ملاحظہ ہو:-

> ''اس کتاب کا پیش لفظ اسی طرح بے جوڑ اور بے ربط طمطراقانہ فقروں اور جملوں سے بھرا پڑا ہے۔ اصل میں فراقؔ قدما کا ذکر اکثر بہت زوروشور سے اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں پر رُعب ڈالا جاسکے کہ وہ قدیم ادبیات اردو سے بھی واقف ہیں۔ حالانکہ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں سے قطعی نابلد تھے۔ صرف زبانی دعوے ہی دعوے ہیں.... فراقؔ نام ونمود کے بڑے متوالے تھے۔ اردو کا قاری بڑا معصوم تھا۔ وہ ادبیاتِ عالم کے چند بڑے بڑے موٹے موٹے ناموں اور چند نامانوس لفظوں اور اصطلاحات کے آتے ہی چونک پڑتا ہے۔ فراقؔ کا یہی وطیرہ رہا ہے۔ اردو والوں کے سامنے چند سنسکرت اور انگریزی ادباء وشعراء اور ان کی تصنیفات

کا ذکر کرتے اور ہندی اور انگریزی والوں کی موجودگی میں فارسی، عربی اور اردو کے شعراء وادباء کا ذکر کرتے۔"

(مشرقی انتقادیات ص:۷۰)

پروفیسر فضل امام رضوی نے فراق گورکھپوری کی جس دُکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے اور ان کے مزاج کی جس کمی کی جانب نشاندہی کی ہے اس سے اہلِ علم واقف اور متفق ہیں وہ خود کو شاعر اعظم گردانتے تھے۔ ان کی اس حقیقت سے رمیش دویدی نے خوب خوب پردہ کشائی کی ہے جسے فراق نمبر نیا دور میں دیکھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر فضل امام نے اپنی بات کی وضاحت میں پروفیسر گیان چند جین کے اقتباس پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے جس سے قاری مطمئن ہوسکے۔

ایک شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعر فہم بھی ہو۔ شعر کی صوری و معنوی خوبیوں اور معائب سے آگاہ ہو۔ عروض و بلاغت کا علم ہو۔ شاعر اپنی بات کس طرح استعارے اور کنائے میں کہہ رہا ہے۔ اس کے ذہن کی رسائی تک خود بھی واقف ہو۔ کسی کے شعر پر تنقید یا تبصرہ کرنے سے قبل اس شعر کے پس منظر پر نظر ہونا بھی لازم ہے۔ گویا ایک مبصر یا تنقید نگار سخن فہم اور سخن سنج ہو۔ ورنہ اس کی تنقید خود اس کی علمی شخصیت کو مجروح کر کے رکھ دے گی۔ یہی حال حضرت فراق کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ انگریزی دانی کے بے جا زعم میں اردو والوں کے سر پر جو کچھ پایا تھوپتے گئے۔ آیئے حضرت یگانہ موہانی کے نہایت معروف اور مشہور شعر پر فراق کی شعر فہمی ملاحظہ کرلیں جس پر سید مسعود حسن رضوی ادیب اور جعفر علی خاں اثر لکھنوی وغیرہ نے بھی بنظر استحسان دیکھا ہے اور اس شعر کی معنویت پر سر دھنتے رہے ہیں مگر افسوس کہ جناب فراق گورکھپوری نے اس شعر میں کیا دیکھا کیا سمجھا پہلے ان کے ہی لفظوں میں ڈاکٹر

فضل امام رضوی یوں نقل کن ہیں۔

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاک نشیمن پر

''موصوف (بیخود) نے غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ وہ اس شعر کو انتخاب الفاظ، سلاستِ بیان سادگی اور ترنم سے سوز و ساز کی آخری منزل پر لے گئے ہیں مگر یہی جزئی خوبیان اس شعر کو ابتذال کے گڈھے میں گرا رہی ہیں۔ غزل میں رونے کا ذکر کرنا، اپنے اوپر بڑی نازک ذمہ داری لینا ہے۔ جس کی کامیاب مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بنام بلبل اگر یا منت سر یاریست
کہ مادو عاشق زاریم کو کار ما زاریست

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

مگر حضرت بیخود کے شعر میں تو رونے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک اور منہ سے گرتی ہوئی رال ناک کی سرخی اور تھرتھراہٹ آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آ رہی ہے جس سے شعر نہایت گھنونا ہو گیا ہے اور مظلوم کے غم کا احترام، یاس کے ساتھ ہمدردی ہونے کے بجاے اس ذلیل قسم کی رقت سے نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ یہ رونا، اظہار غم نہیں جھک مارنا ہے اور یہ ابتذال لب و لہجے سے پیدا ہو جاتا ہے۔''

(انتقادیات ص:٧٦)

ڈاکٹر فضل امام رضوی نے اس شعر کی معنوی خوبیوں کو عیاں کرنے کے بجائے سید مسعود حسن رضوی ادیب کی تشریح جو "ہماری شاعری" میں موجود ہے کا مطالعہ کرنے کی دعوتِ فکر دی ہے۔ مگر متذکرہ اقتباس بالیقین فراق صاحب کے مذاقِ شعر کا پتا مضحکہ پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام رضوی نے فراق گورکھپوری کی دوسری نثری کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مقالہ کی طوالت دامن گیر ہے اس لیے راقم الحروف صرف ڈاکٹر موصوف نے جو آخری پیراگراف حاصل مطالعہ کے طور پر تحریر فرمایا اسے نقل کر رہا ہے:-

> "تنقید فراق کی یہ ہرزہ سرائی، ریزہ خیالی، علمی کم مائیگی اور فنی بے بضاعتی مشتے نمونہ از خروارے پیش کر دی گئی ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے ہر تحریر اسی طرح کی ناہمواریوں اور غیر سنجیدہ رویوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ سب خامیاں اس لیے ہیں کہ فراق اول و آخر شعر کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور شاعری میں تو شکست ناروا کی دلیلیں بھی چلی جاتی ہیں مگر نثر اور خاص طور سے تنقید کی نثر میں کھلا عیب بن جاتی ہیں۔"
>
> (مشرقی انتقادیات ص: ۸۴)

آیئے اسی کتاب یعنی مشرقی انتقادیات میں شامل مقالہ "عہد حاضر میں مرزا دبیر پر تحقیقی و تنقیدی کام کی سمت و رفتار" پر ڈاکٹر فضل امام کی تنقیدی گل افشانی ملاحظہ کرتے چلیں۔ تقریباً ۱۴ صفحات پر مشتمل مقالہ میں ڈاکٹر رضوی نے مقالہ کے دمِ تحریر تک مرزا دبیر پر تحقیقی و تنقیدی جو بھی کام ہوئے ہیں ان کا سرسری جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔

مرزا دبیر ایک نہایت قادرالکلام شاعر ہوئے ہیں۔ انھوں نے دیگر تمام اصناف سخن کے علاوہ مرثیہ نگاری کو خاص موضوع سخن بنایا اور اپنے جوہر طبع سے اردو مرثیہ کو بام عروج پر پہنچایا۔ مولانا شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر لکھتے وقت ایک کو فصاحت تو دوسرے کو بلاغت کا مالک بنادیا۔ انھوں نے ہرایک کی انفرادی شعر گوئی اور شعر کی معنویت پر کوئی خاص اظہار رائے نہ کرکے متوازن بات تحریر کرنا بہتر جانا۔ جو آج بھی متنازع فیہ ہے۔ انیس و دبیر پر متعدد اہل علم نے تحقیقی مقالے لکھے ہیں مگر سچ بات یہ ہے کہ:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پروفیسر فضل امام رضوی دبیر کی مرثیہ نگاری پر اظہار خیال فرماتے ہوئے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:-

''عام طور سے ناقدین اردو ادب دبیر کو ثقالت پسند، طوالت عزیز اور غیر ثقہ روایات کا نظم کرنے والا مرثیہ نگار قرار دیتے ہیں۔ دبیر کے کلام پر اس انداز کی تنقید اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہمارے ناقدین ادب سہل انگاری میں یقین رکھتے ہیں۔ چند مفروضہ امتیازات کے چوکھٹوں میں دبیر کے شاعرانہ اکتسابات کا احاطہ کرنے والے غالباً اردو شعریات کو انتہائی محدود و مسدود متصور کرتے ہیں۔ حالانکہ شعر و ادب کا تمام تر مطالعہ عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ دل سوزی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔''

(مشرقی انتقادیات ص:۵۳۔۵۴)

پروفیسر فضل امام نے اپنے اس مقالہ میں جن کتابوں سے بحث کی ہے ان

میں ۴ تحقیقی مقالے برائے .Ph.D ڈگری بھی ہیں۔ ان کے علاوہ قدیم جرائد ورسائل جو دبیر نمبروں پر مبنی ہیں ان کو بھی اپنے مطالعہ میں لیا ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فضل امام رضوی نے ان کتابوں اور جرائد و رسائل سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے قارئین کو بھی آگاہ کر دیا جائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ''دبستانِ دبیر'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا جو ۱۹۶۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر فضل امام کی رائے ملاحظہ ہو:۔

> ''ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اپنے تحقیقی مقالے ''دبستانِ دبیر'' میں دبیر کی شخصیت اور محسناتِ شعری کو اردو مرثیے کے علاوہ اردو شاعری کے طویل پس منظر میں بڑی خوب صورتی سے اُبھارا ہے۔ ان کا تنقیدی تجزیہ مرزا دبیر کو اردو ادب کی تاریخ میں عہد آفریں قرار دیتا ہے۔''
>
> (مشرقی انتقادیات ص: ۵۷)

دوسرا تحقیقی مقالہ شاد عظیم آبادی کا ''فکر بلیغ'' ہے۔ جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فضل امام رضوی رقم طراز ہیں:۔

> ''اس تذکرے کی اس لیے بھی زیادہ اہمیت ہے کہ اس کے مصنف نے مرزا دبیر میر انیس اور میر مونس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کی صحبتوں میں رہے ہیں۔ انھیں مرزا دبیر کی شاگردی کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے مرزا دبیر کی غیر مصدقہ روایتوں کو نظم کرنے کی بات کہی ہے۔''
>
> (مشرقی انتقادیات ص: ۵۹)

تیسرا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا ''اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام'' کے عنوان سے ہے جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فضل امام رضوی کی تنقیدی رائے اس مقالہ کے ضمن میں ملاحظہ ہو:-

''یہ مقالہ قدیم نظریات'' پرانے جملوں اور فقروں کی قید سے آزاد نہیں ہو پایا ہے اکثر مقامات پر ''المیزان اور ردالموازنہ'' کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔'' (مشرقی انتقادیات ص:۶۰)

> ''دراصل ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی میراث کو مطعون کرنے والی کتب ہی دیکھی ہیں جس میں نجم الغنی اور شؔرر پیش پیش رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کھلا دل و دماغ لازمی ہے۔ بغیر اس کے جو بھی بیان ہوگا وہ سچائیوں سے دور اور لغو ہوگا۔ اسی لیے مظفر حسن ملک مذہبی غلو اور آگے چل کر بادشاہ اور ان کی بیگم کو ضعیف الاعتقاد بھی قرار دیتے ہیں۔'' (مشرقی انتقادیات ص:۶۱)

چوتھا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر محمد زماں آزردؔہ کا ''مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے'' ہے جو ۱۹۸۱ء میں شایع ہوا۔ ڈاکٹر فضل امام رضوی کی رائے ملاحظہ ہو:-

> ''یہ نسبتاً مفصل ہے۔ اس میں دبیر کی شخصیت، سوانح اور شاعری پر علاحدہ علاحدہ سرخیاں قائم کرکے بحث وتمحیص کے لیے پہلو نکالے گئے ہیں۔ لیکن نقد دبؔیر پر بھرپور توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دبؔیر کے فنی نظریہ سے بحث کرتے ہوئے ان کی مرثیہ نگاری کے محرکات وعوامل علمی اعتبار سے زیر بحث

لائے جائیں۔ بغیر اس کے دبیرؔ پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر در حقیقت یہ پہلا کام ہے جس میں تحقیقی و تنقیدی انداز و معیار سے کلام دبیرؔ کو روشناس کرایا گیا ہے۔ نیز ان کی نثر نگاری سے بھی بحث کی گئی ہے۔" (مشرقی انتقادیات ص: ۶۲)

مرزا دبیرؔ پر چند خصوصی شمارے جاری ہوئے۔ ڈاکٹر فضل امام رضوی کی رائے درج کیے جارہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

"سرفراز کے دبیرؔ نمبر میں چودھری سبط محمد نقوی نے اپنے مضمون "خاندانی شاعری اور دبیرؔ و انیسؔ" میں بڑی نتیجہ خیز گفتگو کی ہے اور کسبی اور وہبی شاعری کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ (ص: ۶۲)

"پیام عمل لاہور کے شماروں میں دو مضامین خیال انگیز ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا مضمون "اردو ادب کی توسیع میں دبیرؔ کا حصہ" بہت معلومات افزا اور تنقیدی بصیرت کا حامل ہے۔ دوسرا مضمون ایم عبداللہ راتھ کا "دبیر کی شاعری" ہے۔ اس میں دبیر کی شاعری کا تعارفی خاکہ پیش کرتے ہوئے اردو شعر و ادب کی طویل روایت کے آئینے میں دبیر کی شعری اور فنی انفرادیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔" (ص: ۶۳)

آئیے اب پورے مضمون کا حاصل مطالعہ بھی ملاحظہ کرلیں:۔

"مشرقی انتقادیات اور فنونِ شاعری کے جملہ صفات کے آئینے میں بھی کلام دبیرؔ کا مطالعہ ضروری ہے۔ علم معانی، علم بیان، ایجاز و مساوات، علم العروض اور علم القوافی کے پیش نظر دبیر کی شاعری کا

احتساب از بس کہ ضروری ہے۔ دبیرؔ نے اپنی شاعری میں جو مترادفات
کی کائنات آباد کی ہے اس پر بھی ہمارے ناقدین نے آج تک خاطر خواہ
توجہ نہیں کی ہے۔ مرزا دبیرؔ کے کلام کا ایک صحیح متن بھی تیار کرنا لازمی
ہے۔ دبیرؔ نے جس زبان کو برتا ہے وہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں اور
لکھنؤ کے کوچوں اور گلیوں کی نہیں بلکہ فارسی اور عربی کے گاڑھے خمیر سے
بنی ہے جس میں مذہبی معتقدات اور تہذیبی اصلاح بھی پوشیدہ ہے۔
ناقدین کو اس نکتہ کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔" (ص:٦٦)

پروفیسر فضل امام رضوی کا ایک دوسرا مقالہ "امعانِ نظر" کے نام سے ۲۰۱۱ء میں شایع شدہ کتاب میں بعنوان دبیرؔ شناسی اور ڈاکٹر تقی عابدی شامل کردہ کتاب "مثنویات دبیر" پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر رضوی نے اس کتاب کو دبیر شناسی کے ضمن میں اہم تخلیق تسلیم کیا ہے۔ اس میں مرزا دبیر کی آٹھ مثنویوں کو عالمانہ انداز فکر سے مزین قرار دیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے احسن القصص، معراج نامہ، ابواب المصائب، مصحف فارسی، ملک سلام دبیرؔ، مجتہد نظم مرزا دبیر اور طالع مہر پر سرسری جائزہ لیا ہے۔ کل ۷ر صفحات پر مشتمل مضمون میں ڈاکٹر تقی عابدی کی دبیر شناسی کتاب پر اجمالی جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر رضوی صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

"درحقیقت دبیر شناسی کے ذیل میں ڈاکٹر تقی سید عابدی
کے اس اہم ترین اور گراں قدر تحقیقی، علمی اور ادبی کارنامے کو دنیائے
علم و ادب ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گی۔"

(امعانِ نظر ص:۱۴۶)

"دبیر کے فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا

ہے کہ دراصل دبیریت تفکر اور تفلسف کے گہرے سوتوں کا نام ہے
جو ہر لمحہ باشعور قارئین کا امتحان لیتی ہے۔ دبیریت نام ہے اس
تفحص علمی اور وسعتِ علمی کا، جو شعر و ادب کی تقدیر بھی ہے تعمیر و تعبیر
بھی۔ یہی سبب ہے کہ لوگ گہرے پانیوں کی گود میں نہیں اترتے اور
سطحی طور پر ادھر ادھر کی عمومی باتیں کر کے گذر جاتے ہیں۔"

(امعانِ نظر ص: ۱۴۱)

متذکرہ کتاب میں سجاد حیدر یلدرم کی شاعری پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے۔ پروفیسر فضل امام رضوی نے اس مضمون میں حیدر یلدرم کی معروف نظموں کو زیر بحث لانے اور ان پر تبصرہ کرنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ سجاد حیدر کی طبع رواں کے بارے میں رقم طراز ہیں:-

"یلدرم کو دعوائے شاعری نہیں تھا، لیکن وہ شاہد شعر کے
شیدائی ضرور تھے۔ شاہد معنی کی یہ تلاش ہی ان کی طبع موزوں اور
رنگینیٔ مزاج سے خوبصورت شعر کہلواتی تھی۔ ان کے نالۂ دل کش
میں ایسی غضب کی تڑپ اور تاثیر تھی جس سے پیر بھی عالم جوانی کی
سیر کرتا تھا۔" (مشرقی انتقادیات ص: ۱۳۴)

پروفیسر فضل امام رضوی سجاد حیدر یلدرم کی نظموں اور غزلوں پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد آخرش اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

"یلدرم تخیلات و حسیات کی دنیا سے افکار شعری تلاش
کرتے ہیں اور پھر اسے پیمانۂ شعر میں خوب صورتی سے ڈھال لیتے
ہیں لیکن اوّل و آخر تلاش حسن اور اس کے بانکپن میں سرگرداں رہنا
ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یلدرم

نے اردو شاعری کو اپنے مذاقِ لطیف اور حرکتِ فکر سے آشنا کیا۔ وہ
واقعتاً مہدی افادی کی طرح ''جذباتی فلسفی'' تھے اور یہی جذباتیت
ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔''

(مشرقی انتقادیات، ص: ۱۳۸)

پروفیسر سید فضل امام رضوی کی پوری زندگی درس وتدریس سے وابستہ رہی۔ وہ اعلیٰ درجات کے طلباء وطالبات کی ذہن سازی کرتے رہے ہیں۔ اس لیے ان کی نظر کلاسیکل شعراء وادباء کی تخلیقات پر بھی گہری ہے۔ مدتِ دراز تک کلاسیکل شعراء کے کلام کو یونیورسٹی میں پڑھانے سے نئی نئی جہتیں اور جدتِ فکر کے زاویے از خود استاد کے ذہن وفکر پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا اظہار صفحۂ قرطاس پر کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہی تاثر اور کیفیت پروفیسر فضل امام رضوی پر بھی طاری ہوئی ہوگی جس کے نتیجہ میں وقتاً فوقتاً مضامین کی شکل میں منصۂ شہود پر آئے۔ جو کتابی شکل میں ''امعانِ نظر'' کے نام سے مجموعہ مضامین شائع ہوکر منظر عام پر آ گیا ہے۔ جس میں کل مضامین ہیں۔ جن میں چکبست، میر تقی میر، جوش ملیح آبادی، دبیر، کبیر، اکبر الہ آبادی، اختر شیرانی، مولانا محمد علی جوہر، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری کی شاعری سے بحث کی گئی ہے جبکہ پروفیسر احتشام حسین، سجاد ظہیر، پریم چند، ممتاز مفتی وغیرہ کی نثری تخلیقات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اردو تنقید اور اردو میں جدید مرثیہ نگاری کو بھی موضوع تبصرہ بنایا ہے۔

متذکرہ تمام عناوین پر دانشورانِ ادب اظہار خیال فرما چکے ہیں۔ مگر پروفیسر فضل امام رضوی نے ان تمام مقالات میں انفرادیت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ کلاسیکل شعراء میں منفرد لب ولہجہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان میں پائی جانے

والی کسی خاص جہت کو پیش کرنا ہی ان کا خاص مقصد ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ میری تقی میرؔ اردو شعر و نغمہ کا ایسا شاعر ہے جس پر بے شمار مقالات اور تحقیقی کتب تحریر کی جا چکی ہیں مگر پھر بھی بعض موضوع ایسے ملیں گے جن پر خاطر خواہ یا اقلیم سخن میرؔ کے شایانِ شان نہیں۔ پروفیسر فضل امام رضوی نے خدائے سخن میرؔ کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ میرؔ کی غزلیہ شاعری پر اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر میرؔ غزل کا شاعر ہے۔ اور غزل حسن و عشق کی داستان دلبری اور ادائے کافری اور قاہری سے عبارت ہے۔ میرؔ نے بھی عشق سے اپنے آپ کو وابستہ کر رکھا ہے۔ لیکن یہ وابستگی رویّے اور جسم کی ایک انتہائی بلاخیز کیفیت کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ جہاں جسم اپنی تمام پر جلوہ سامانیوں کے ساتھ روح کے تتبع میں تطہیر نفس کا مظہر ہے۔ اور عشق، سوز و ساز کے حسین امتزاج سے روح کی لذتوں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔''

(امعانِ نظر ص: ۲۰)

''میرؔ کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کا تہذیبی اور فکری پس منظر ملتا ہے۔ آج کے اس دورِ ظلمات میں جب کہ انسانی اقدار حیات پامال ہو رہی ہیں۔ میرؔ کی شاعری اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ حوصلۂ زیست اور روشنی عطا کر رہی ہے۔ اور تلخیِ حیات میں زندگی کا پیغام دیتی ہے۔''

(امعانِ نظر ص: ۲۸)

عہد حاضر کے جن شعراء نے اردو غزل کی زلفیں سنوارنے میں اہم کردار ادا

کیا ہے ان میں مجروحؔ سلطانپوری کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی فکر میں بلوغیت ہے۔ وہ اپنی بات منفرد لب ولہجہ میں کہتے ہیں۔ عرفی شیرازی اور حافظ شیرازی کے کلام کو اکثر پڑھتے رہے۔ پروفیسر فضل امام رضوی کی بھی نگاہِ توجہ ان پر پڑی۔ اور ان کی شاعری پر اظہار خیال فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ''مجروحؔ نے اپنی نکتہ چینیوں کی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنی راہ چلتے رہے۔ یہی ان کا البیلا پن ہے جس سے اردو غزل ایک نئے بانکپن سے آشنا ہوئی۔ ان کا سرمایۂ شاعری کم ہی سہی لیکن اس کمیت میں کیفیت کے دریاؤں کی روانی، آبشاروں کا ترنم، چٹانوں کی مضبوطی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی بھر غزل اور صرف غزل کے اسلوب پر فریفتہ رہے۔ نگارِ غزل کا جادو ان کے شاعرانہ افکار پر سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔'' (امعانِ نظر ص: ۶۸)

منشی پریم چند اردو افسانوی ادب اور ناول نگاری میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے افسانے چلتی پھرتی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ وہ سماجی زندگی سے اپنے افسانوں کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں کے کردار بھی عوامی زندگی سے وابستہ رہے۔ پریم چند کے افسانوں کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں مخفی ہے۔ پروفیسر فضل امام رضوی نے بھی پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کی تلاش کی ہے۔ ان کی نظر میں منشی جی کی تمام تر تخلیقات رہی ہیں۔ وہ منشی پریم چند پر اپنی رائے یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشی پریم چند نے اپنے تصور حیات کو اپنا مقصد حیات بنایا اور اسی مقصد حیات کو بروئے کار

لانے کے لیے اپنے افسانوی ادب کو مرکز ومحور قرار دیا۔ جس میں ہندوستان اور خاص طور سے یہاں کے دبے کچلے، پسماندہ عوام، مظلوم و بے بس، بیکس و مجبور مزدوروں اور محنت کشوں کی زندگی اور ان کے سماجی مسائل کی سچائیوں کو فنکارانہ طور پر اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔ جس میں ہندوستان سماج کے مختلف رنگ و روپ نمایاں طور پر ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کی فنکارانہ کاوشوں اور تخلیقی عمل کا دائرہ وسیع ہے اور صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سبھی زبانوں کی افسانہ نگاری نے ان کے حقیقت پسندانہ فکر وفن سے استفادہ کیا ہے۔ پریم چند کا پورا افسانوی ادب صداقتوں کا علم بردار ہے۔ حقیقتوں کی ادبی دستاویز ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا جانا ادب کی تفہیم کے لیے از بس کہ لازم ہے۔''

(امعانِ نظر ص: ۱۲۵)

پروفیسر فضل امام رضوی نے زیر مطالعہ مجموعۂ مضامین ''امعانِ نظر'' میں کبیر اور اکبر الہ آبادی، اختر شیرانی، سجاد ظہیر اور ذکر حافظ شیرازی اور پروفیسر احتشام حسین کے تنقیدی نظریات وغیرہ مقالات بہت پُر مغز تحریر فرمایا ہے۔ ان کا مطالعہ اردو ادب کی تمام تخلیقات پر بہت گہرا ہے۔ وہ جو کچھ ضبط تحریر میں لاتے ہیں نہایت وسیع مطالعہ کے بعد۔ ان کا طرز اسلوب رواں اور سلیس ہے۔ وہ اپنی بات بہت صاف ستھرے انداز میں کہنے کا اعلیٰ ہنر رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت بہت اہم ہے وہ بہت ژرف نظر کے مالک ہیں۔ تحقیق اور تنقید ان کے مطالعہ کے خاص موضوع ہیں۔ منجملہ تمام اصناف ادب اور کلاسیکل شعراء کے ادبی اثاثے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ تنقید

کے اصول ونظریات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے جب کسی ادبی شخصیت یا اس کی تخلیقات پر تنقیدی رائے دیتے ہیں تو بہت متوازن اور معتبر ہوتی ہے۔ اردو میں بہت سے ایسے گوشے ہیں۔ جو ایسے ہی محقق اور ناقد کے منتظر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر سید فضل امام رضوی عصر حاضر کے نمائندہ اور نامور محقق اور ناقد ہیں۔ ان کی تنقیدی نظر، ادب کے شہ پاروں کو جانچنے میں کسی جانب داری کی شکار نہیں ہوئی۔ وہ اردو کے عظیم دانشور ہیں۔ مستقبل قریب میں اردو ادب کو پروفیسر موصوف سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ امید ہے اب وہ پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہیں گے۔

ڈاکٹر شاداب تقدیر

پروفیسر فضل امام رضوی کا تنقیدی شعور و وقوف

زندگی ایک پُر اسرار شے ہے۔ یہ نشیب و فراز، پیچیدگی، تحرک و انجماد، ترقی و تنزل کا مجموعہ ہوتی ہے۔ زندگی کی تفہیم و تعبیر مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ زندگی کے امکانات کی لامحدودیت کو کسی حد تک ہی حیطۂ مطالعہ میں لایا جا سکتا ہے۔ زندگی کی یہی عظیم پُراسراریت دنیا کے تمام تر علوم وفنون کے ارتقاء کی محرک ہے۔ یہ پُر اسراریت نہ تو مکمل طور پر واضح ہو سکتی ہے اور نہ ہی گرفت میں آسکتی ہے۔ ادب وفن کی صورت حال بھی کچھ یوں ہی ہے، ادب کی تخلیق بھی ایک پراسرار عمل ہے، ادب کی پراسراریت ہی ادب کو عظمت اور آفاقیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ جس فن پارے میں پراسراریت کی جتنی دبیز پرتیں ہوں گی، اس میں تفہیم و تعبیر کے اتنے ہی امکانات پوشیدہ ہوں گے۔ تنقید اس پراسراریت کی گرہ کشا ہے۔ اگر چہ تنقید ادب کا ایک حد تک ہی احاطہ کر سکتی ہے لیکن ادب کی پراسراریت کی گرہ کشائی میں اس کی معاونت واہمیت سے انکار ناممکن ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ تنقید کے بغیر ادب کی تفہیم کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور یہ بھی کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ اگر تنقیدی فراست خالق ادب کو میسر نہیں تو وہ عظیم ادب کی تخلیق کرنے سے قاصر رہے گا۔

تنقید کسی ادب پارے میں محض ذاتی تاثرات کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ تنقید اب مکمل طور پر علم کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ آج جس مقام پر تنقید فائز ہے، یہاں تک پہنچنے میں اس نے ایک طویل عمر اور بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ ان منازل کے شعور وادراک کے بغیر ادب وفن کی تفہیم کا عمل ممکن نہیں۔ صاحب نظر نقاد کے لئے تنقید کے نشیب وفراز سے واقف ہونا اشد ضروری ہے۔ نقاد کی ذمہ داریاں تخلیق کار کے فرائض سے زیادہ ہوتی ہیں۔ نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ فلسفہ وتنقید اور تاریخ و تہذیب کے امتزاج سے حاصل ہونے والی تہہ دار بصیرت کا حامل ہوتا کہ وہ تخلیقی قوتوں کے بحرِ بے پایاں سے گوہر آبدار نکالنے میں کماحقہ کامیاب ہو سکے۔

پروفیسر فضل امام رضوی کا شمار ایسے ہی ناقدین ادب میں ہوتا ہے جن کے یہاں فکری وسماجی بصیرت، عمیق مطالعہ اور فہم وفراست کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ ان کے تنقیدی اور فکری رویوں کی نشاندہی ان کے مختلف النوع مضامین سے ہوتی ہے جن میں ان کا علمی تعمق اور منطقی جواز آگہی کی جوت جگا رہے ہیں۔ ان کے نقد پارے فکر انگیز اور خود اعتمادی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی تحریروں میں وہ رچاؤ ملتا ہے جو ادبی روایت کے گہرے شعور سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کی تنقید کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے عیب جوئی اور نکتہ چینی کو مقصد تنقید نہیں بنایا ہے بلکہ ان کی تنقید نکتہ آفرینی اور تفہیم وتحسین کو اپنا مقصد خاص قرار دیتی ہے۔

ڈاکٹر فضل امام صاحب کے قلم سے یوں تو کئی تصانیف منصۂ شہود پر آئیں جن میں ''امیر اللہ تسلیم۔ حیات وشاعری''، ''مثنوی خنجر عشق''، ''افکار ونظریات'' ''انیس، شخصیت اور فن''، ''شاعر آخر الزماں، جوش ملیح آبادی''، ''مشرقی انتقادیات، اصول ونظریات''، ''تنقیدی معیار''، ''بھوجپوری ادب کا تعارف''، ''جدید ہندی شاعری،

سمت و رفتار''، ''راجستھانی زبان و ادب، ایک تعارف'' وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ تصانیف تحقیق و تنقید کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ پروفیسر موصوف نے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کی سنگلاخ وادیوں کو بھی عبور کیا ہے۔ ان کے تحقیقی کارنامے بھی گراں قدر اور باوقار ہیں۔ ان تمام تصانیف کے مطالعہ سے ان کے تنقیدی شعور و نظریات کا اندازہ بحسن وخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ نقاد کے منصب اور اس کے فرائض سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہوئے ہیں۔

> ''نقاد کا منصب اور کام بہت اہم ہے۔ اس میں سہل انگاری کا دخل نہیں بلکہ دقت نظر، عرق ریزی اور تخلیقی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ ذہانت اور فراست کے بغیر تنقید کے معیار کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ اصل نقاد وہ ہوسکتا ہے جو فن و ادب کی اصلی اور سچی روح کو پہچان سکے اور اپنے نظریاتی حدود اور ذہنی تعصبات سے بلند تر ہو کر ادبی و فنی تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر وہ ہیرو پرستی کا شکار ہو جائے گا تو اپنے انتقادی احتساب میں غیر جانب دار اور دیانت دار نہ رہ سکے گا۔''

ادب و فن کی سچی روح کو پہچاننا اور اس کی تلاش کرنا ہی تنقید ہے۔ اس کے لئے بڑی عرق ریزی کی ضرورت پڑتی ہے۔

کیوں کہ نقاد کو تخلیق کے باطن میں اتر کر اس کے تمام تر پہلوؤں کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور پھر وہ تخلیقی فراست سے کام لے کر اس کی ''تخلیق نو'' کا کارنامہ انجام دیتا ہے گویا کہ تنقید ''تخلیق مکرر'' کی حیثیت رکھتی ہے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ تخلیق عمل سے گزرنے اور تخلیقی کرب کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

پروفیسر فضل امام صاحب کے یہاں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ وہ تنقید کے مروجہ نظریات کی روش پر گامزن نہیں ہوتے بلکہ ان کا ذوقِ جستجو اور ان کی علمی بصیرت نیا در کھولنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ تنقید کے مروجہ نظریات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''تنقید نہ تو کھوٹے کھرے کی پرکھ کا نام ہے، نہ تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا عمل ہے اور نہ سوپ سے اناج صاف کر کے بھوسا علاحدہ کرنے کا طریقۂ کار ہے۔ جیسا کہ ایک طرف لغات سے لے کر چھوٹی موٹی کتابوں میں سہل انگاری کے پیش نظر تنقید کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا جاتا ہے تو دوسری طرف تنقید خفیہ پولیس کا عمل انجام دیتی ہے جو مُجرمین کی تلاش میں چکر لگاتی رہی ہے۔ بعض کے نزدیک تنقید تخلیق کی دُشمن ہے اور جن میں تخلیق کی دُشمن ہے اور جن میں تخلیقی صلاحیتیں نہیں ہوتیں وہی تنقید کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تنقید کی یہ سب کی سب جذباتی اور مفروضاتی تعریفیں ہیں۔''

پروفیسر فضل امام نے ان تمام مروجہ تعریفات سے انحراف کیا ہے۔ آج کی بیشتر تنقید خفیہ پولیس کا کارنامہ انجام دینے میں سرگرم عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقد پاروں کو استناد کا درجہ حاصل نہیں ہو پاتا۔ ایسی تنقید کی عمر مجرمین کی تلاش میں ہی صرف ہو جاتی ہے اور اپنے شباب سے پہلے ہی مرگ ناگہاں سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم اسے تنقید نہیں کہہ سکتے تو پھر تنقید کیا ہے؟ پروفیسر فضل امام لکھتے ہیں۔

> ''تنقید دراصل کسی شے کی حقیقت کے صحیح اور سچے عرفان کا نام ہے۔''

سچی اور صحیح تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ:۔

''ہر سچی اور صحیح تنقید کا فرض یہ ہے کہ وہ خلاق کے دل میں جھانک کر اس کی روح کی نقاب کشائی کرے لیکن خلوص کی شمولیت بہر طور ضروری ہے۔''

'خلوص کی شمولیت' کے بغیر تنقید کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تنقید جب تک ذاتی پسند و ناپسند اور ذہنی تعصبات سے مبرا نہیں ہوگی، شعر و ادب کی سچی ترجمان نہیں ہو سکتی، سچی تنقید کو تخلیقی ادب کے سرچشموں تک رسائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ وہ فنکار کے ساتھ سفر تو شروع کرتی ہے لیکن اقدار کی تلاش و جستجو اور معائر کے تعین میں اسے فنکار سے آگے بھی جانا پڑتا ہے۔

پروفیسر فضل امام صاحب کے نقد پاروں کے مطالعہ سے ان کا علمی تفحص، فکری و سماجی بصیرت اور منطقی استدلال کے ساتھ ہی ان کی تحقیقی ریاضت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی تنقید تحقیقی عناصر سے مزین ہوتی ہے جو ان کی تنقید کو باوقار بناتے ہیں۔ یہ تحقیق محض تاریخی حقائق کا بیان ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ ادبی اسباب کی بازیافت کرتی ہے۔ وہ کسی بھی ادب پارے کے تعین قدر کے لئے اس کا مطالعہ گہرائی سے کرتے ہیں اور اسے فن کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی آراء بہت متوازن اور دوٹوک ہوتی ہیں۔ وہ خیالات کے اظہار میں پس و پیش سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں براہِ راست کہتے ہیں۔ وہ تنقید کے بارے میں سائنٹفک رویہ رکھتے ہیں، یہ رویہ ان کے ذوقِ جستجو اور تحقیقی ریاضت سے وجود پذیر ہوتا ہے، اس لئے ان کی تحریر بہت رواں، سلیس، شگفتہ اور دل نشیں ہوتی ہے۔ انھوں نے جس موضوع اور جن لوگوں پر خامہ فرسائی کی، ان کے محاسن و معائب

دونوں پر بہت ہی متوازن انداز میں لکھا۔ ان کا لب ولہجہ درشت نہیں بلکہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ فضل امام صاحب کا مشرقی ادب کا مطالعہ بڑا گہرا ہے۔ وہ اردو کے کلاسیکی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور بالخصوص وہ مشرقی تنقید کی روایت سے پوری طرح واقف ہیں۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ انگریزی کی تنقیدی تحریروں کا اردو میں الٹا سیدھا ترجمہ کرکے اردو کی تنقیدی روح کو نہ صرف مجروح کیا جاتا ہے بلکہ یہ تحریریں چوں چوں کا مربہ معلوم ہوتی ہیں۔ تنقیدی شعور بیدار کرنے کے لئے ذہن ودل کو فطری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا اور ادب پارے کو اس کے عہد کے تخلیقی شعور اور تخلیقی ادب کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ تنقید کے لئے تخلیقی احساس کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو نقاد تخلیقی احساس سے عاری ہوتے ہیں ان کے یہاں توازن کا فقدان ہوتا ہے۔

اچھی تنقید خانوں میں نہیں بٹ سکتی ہے۔ وہ ادب کا مطالعہ غیر مشروط طور پر کرتی ہے۔ اس کا مقصد مجادلہ ومقابلہ نہیں بلکہ روایت کا احساس، اقدار کی اشاعت اور تجربات کی پرکھ ہے۔ علامہ شبلی نے 'موازنہ انیس ودبیر' لکھ کر جس 'غیر متوازن تنقید' کی ابتدا کی تھی وہ ہنوز کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ فضل امام صاحب نے اس سلسلے میں بڑی متوازن بات لکھی ہے۔

> "ستم ظریفی حالات کہئے یا ناسازگاری مزاجِ ادب کہ اب تک سارا زور مرزا دبیر اور میر انیس کے موازنے ہی میں صرف کیا جاتا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ مناظرے، مجادلے، مجاہدے اور مقابلے کے عادی حضرات فن کا معیار صرف تقابل میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ گو کہ یہ کسی فن اور فنکار کے لئے بڑی بدنصیبی کی بات

ہے کہ اس کے فن پارے کو مقابلے کے سپرد کر دیا جائے۔ اس سے
دراصل اس کی صحیح منزلت، فنی قدر و قیمت، علمی و ادبی انفرادیت اور
شعری ندرت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرغ
بازی، بٹیر بازی اور تیتر بازی نے ہمارے ذہنوں میں مقابلے بازی
کو بھی جنم دیا اور دبیرؔ اور انیسؔ کی اہمیت یاران چارہ جو نے صرف متحد
المضامین اشعار کے مقابلے میں ہی محصور کر لیا۔ انسانی نفسیات کے
مختلف روپ ہیں اس کو کیا کہا جائے کہ ہم پہلے شخصیتوں کے بت
تراشتے ہیں، پھر پوجنے لگتے ہیں اور جب ذوق تقابل بڑھتا ہے تو
ان کو ٹکراتے ہیں اور لطف اندوز ہونے لگتے ہیں اس لئے سارا زور
اسی میں صرف ہو جاتا ہے۔"

پروفیسر فضل امام کو اردو زبان و ادب کی طرح ہندی زبان و ادب سے بھی شغف ہے۔ انھوں نے ہندی ادب کے متعلق جو مضامین قلم بند کئے، ان کے مطالعہ کے بعد ان کی ہندی شناسی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کو ہندی زبان میں مرتب کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ 'بھوجپوری زبان و ادب' راجستھانی زبان و ادب، ہندی شاعری میں جدید رجحانات، سنسکرت ناول، اردو زبان پر ہندو تہذیب اور مذہب کے اثرات، ہندی شاعری میں تلسی داس کا مقام، تلسی داس آئینۂ روایات میں، جیسے وقیع مضامین لکھ کر اردو کے دامن کو گراں بار کیا۔ انتخاب کلام جوشؔ، مولانا ابوالکلام آزاد، پاکستان کا پرت وردھی اردو ساہتیہ جیسی کتابیں ہندی زبان میں لکھیں۔

فضل امام صاحب کی ادبی کارگزاریوں کو کسی ایک مقالے میں قلم بند کرنا

ممکن نہیں۔ان کی تنقیدی کاوشیں مختلف الجہات ہیں۔انھوں نے جس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی اسے بڑی دیانت داری اور خلوص کے ساتھ برتا ہے۔میں اس مقالے کا اختتام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ان جملوں سے کرنا چاہتا ہوں۔

> ''ڈاکٹر فضل امام کے تحقیقی وتنقیدی کاموں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔دراصل یہ ہمارے ان نوجوانوں میں ہیں جنھوں نے تحقیق وتنقید کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔انھوں نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا ہے اس میں پوری طرح ڈوب کر اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔''

ڈاکٹر عباس رضا نیر
شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی

پروفیسر فضل امام بحیثیت انیسؔ شناس

میر انیسؔ نے اردو شاعری کو جس سوز و گداز اور جن اعلیٰ انسانی قدروں سے ہم کنار کیا اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ انیسؔ اردو کے بڑے شاعر تو ہیں ہی دنیا کی دوسری زبانوں کے بڑے شاعروں میں بھی بہت کم ایسے شعرا نظر آتے ہیں جنھیں انیسؔ کے مدمقابل رکھا جا سکے۔ انیسؔ کا زمانہ (۱۸۰۳ تا ۱۸۷۴) اخلاقی زوال اور تہذیبی انحطاط کا زمانہ تھا جس میں حق گوئی، بے باکی، روشن خیال، فکری آزادی، صلۂ رحمی، حقوق انسانی کی بازیابی اور جانثاری وفداکاری جیسے عناصر ہندوستانی معاشرے میں ہی نہیں عالمی انسانی سماج میں عنقا تھے۔ انگریزوں کی غلامی کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہندوستان اپنی ان اخلاقی روایات کو بھی کھو چکا تھا جو اس ملک کی بنیادی شناخت تھیں۔ ایسے میں انیسؔ نے عراق کی سرزمین پر ۶۱ ہجری میں رونما ہونے والے تاریخ انسانی کے اس عظیم واقعے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جس میں تمام تر ارفع و اعلیٰ انسانی قدروں کی روشن مثالیں موجود تھیں۔ انیسؔ اپنے مرثیوں کے ذریعے ان تمام قدروں کو پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے اور اردو زبان و ادب کو عالمی ادب میں جگہ دلانے کے لئے خاطر خواہ تخلیقی ذخیرہ چھوڑا۔

انیس صدی تقریبات کے بعد انیس و دبیر پر اردو میں تحقیق و تنقید کے بہت کام ہوئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرثیے کے ان دونوں اہم ترین شعرا پر تحقیق و تنقید کے بیشتر کام افراط و تفریط کا ہی شکار رہے۔ ہمارے بیشتر محققین و ناقدین شبلی نعمانی کی قائم کردہ موازنے کی روایت سے باہر نہیں نکل سکے۔ انیس شناسوں کا دوسرا طبقہ جس نے کلام انیس میں منظر نگاری، جذبات نگاری، جزئیات نگاری، حفظ مراتب، ڈرامائی عناصر، رزمیہ عناصر اور زبان و بیان کی خوبیوں پر خاصا زور قلم صرف کیا وہ بھی مسعود حسن رضوی کے رثائی معیار نقد کو بہت آگے نہیں لے جا سکے۔ ہمارے ناقدین کا ایک اور گروہ مشرقی قدروں سے بے نیاز ہو کر صرف مغربی تنقید کی میزان پر مرثیوں کو رکھ کر اپنی رائے قائم کرتا رہا۔ ایسے میں پروفیسر فضل امام لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ موازنے اور مناظرے کے بغیر صرف انیس شناسی کو موضوع بنا کر دنیائے ادب کے سامنے ''انیس شخصیت اور فن'' کے عنوان سے ایک گراں قدر تحقیقی و تنقیدی دستاویز پیش کی۔ جس پر گورکھپور یونیورسٹی نے پروفیسر فضل امام کو ڈی۔ لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ 348 صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ۱۹۸۴ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا۔

پروفیسر فضل امام کی تصنیفات و تالیفات ''امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری'' ''مثنوی خنجر عشق: ترتیب و مقدمہ''، ''بھوجپوری ادب کا تعارف''، ''جدید ہندی شاعری: سمت و رفتار''، ''مثنوی نغمۂ مسلسل''، ''افکار و نظریات''، ''دیوان درد کا نقش اول'' ''راجستھانی زبان و ادب'' اور ''موازنۂ انیس و دبیر کی ترتیب و تقدیم'' وغیرہ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروفیسر فضل امام اپنے ادبی سفر میں کسی ایک

مکتب فکر، نظریے، تحریک، رجحان یا ازم سے بندھ کر نہیں رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی رائے کبھی بھی ترجیحات و تعصبات کی بنیاد پر کسی طرح کی جانب داری کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ اہل نظر کے سامنے کسی بھی سود و زیاں کی پرواہ کیے بغیر نہایت بے باکی اور برجستگی کے ساتھ اپنا مطمح نظر پیش کرتے ہیں۔ یہی ان کی تحریروں کا مابہ الامتیاز ہے۔ ''انیس شخصیت اور فن'' بھی انھیں اوصاف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''انیس شخصیت اور فن'' کا بالاستعیاب مطالعہ کرنے والے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ پروفیسر فضل امام اپنی وسعتِ مطالعہ اور اخذ نتائج کی بھرپور صلاحیتوں کے باعث کتاب کے پہلے باب سے ہی قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ نہایت شرح و بسط کے ساتھ تجزیے اور تشریح کے مرحلوں میں داخل ہوتے ہوئے کتاب کے ابتدائی اوراق کے مطالعے سے ہی یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ انیسیات کی تعبیر و تفہیم میں پروفیسر فضل امام نے کتنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب ''اردو مرثیہ قبل انیسؔ'' میں ہی مرثیے کے اوّلین نقوش کو تلاش کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام بہت آگے تک نکل گئے ہیں اور مرثیے کی تاریخی کڑیوں کو انسانیت کی ابتدائی تاریخ سے جوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے صرف زبانی دعوے نہیں کیے ہیں بلکہ تاریخ آدم و عالم سے اپنے دعوے کی دلیلیں بھی فراہم کی ہیں۔ مرثیے کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے عربی شعر و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ عربی شعر و ادب کے ارتقا میں مراثی نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

عربی شاعری میں مرثیے کی صورت حال کا جائزہ لینے میں مصنف نے بہت کم لفظیں صَرف کی ہیں لیکن عربی مرثیہ نگاری کی تاریخ کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ

احاطہ کیا ہے۔ مرثیے کی تاریخ جب عربی سے فارسی میں منتقل ہوتی ہے تو اس صنف کی ہیئت اور ماہیت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احاطہ بھی پروفیسر فضل امام نے نہایت باریک بینی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی تحریر کا یہ اقتباس دیکھئے:۔

> ''جب جذبات کو ٹھیس لگتی ہے، جب دل کے تار چوٹ کھا کر جھنجھنا اٹھتے ہیں، قلب و ذہن میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے تو مرثیہ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ عربی مرثیہ نگاری کی یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے عجم کو بھی متاثر کیا۔ وہاں بھی مرثیے کی اصطلاح جاری ہوئی، لیکن عرب کے ریگزاروں اور کہیں کہیں نخلستانوں کی فضا سے نکل کر جب مرثیہ ایران کے چمنستانوں میں پہنچتا ہے تو اس کی ہیئت اور روپ میں تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ عرب و عجم کے مزاجوں اور جغرافیائی و تہذیبی ماحول کے فرق ظاہر ہونے لگتے ہیں جس سے فارسی کے مرثیوں میں آمد کی بجائے آورد، برجستگی اور بے ساختگی کی جگہ تصنع و آورد کا بول بالا ہو گیا۔'' (ص :۲۱)

عرب سے ایران، ایران سے ہندوستان، ہندوستان سے بیجاپور گولکنڈہ، دہلی اور اودھ میں مرثیہ کن نئی اور پرانی روایات کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اردو مرثیہ عربی اور فارسی مرثیہ کے قائم کردہ کن خطوط پر گامزن ہوتا ہے اور کہاں کہاں اپنی راہیں الگ کرتا ہے۔ ہیئت اور ماہیت کی سطح پر کن تبدیلیوں سے دو چار ہوتا ہے، زبان و اسلوب کے کیسے کیسے تغیرات رونما ہوتے ہیں ان تمام جہات و نکات کا احاطہ پروفیسر فضل امام نے کتاب کے پہلے باب میں بڑی دقتِ نظر کے ساتھ کیا۔ ماقبل انیس نمائندہ اور منتخب شعرا کے مراثی سے چیدہ چیدہ مثالیں پیش کر کے فاضل مصنف نے

اپنے مطالعے کو مزید وقیع بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب پروفیسر فضل امام نے انیس کی شخصیت کے لئے مخصوص کیا ہے۔ جس میں انیس کے اسلاف واخلاف، وضع قطع، عادات وخصائل، تعلیم و تربیت، معاشرہ وماحول اور گردوپیش کے حالات وکوائف، منظروپس منظر کا احاطہ کیا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے عناصر جو شخص کو شخصیت بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں پروفیسر فضل امام نے ان سب کی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں اور ان کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ فاضل مصنف کے قلم سے انیسؔ کے سراپا اور مزاج پر نظر تو ڈالئے۔:

> ''وضع قطع کے بہت پابند تھے۔ بدن چھریرا لیکن ورزشی، شہ سواری، شمشیرزنی اور بنوٹ میں مشاق تھے۔ قد اوسط لیکن مائل بہ درازی، کسرتی بدن ہونے کے باعث چست اور گٹھا ہوا، سینہ کشادہ، گردن صراحی دار، چہرہ کتابی کھلا ہوا، آنکھیں بڑی بڑی، لال لال ڈورے، رنگ گندمی تھا۔ داڑھی مونچھوں کے مقابلے میں چھوٹی اور باریک، اتنی باریک کہ دور سے مُنڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر پر حباب کی شکل کی چوگوشیا ٹوپی، نیچا گھیر دار کرتا، ڈھیلی مہری کا سفید پائجامہ اور گٹھیلا جوتا استعمال کرتے تھے۔ ہاتھ میں ہلکی خوبصورت چھڑی اور رومال بھی لازمی طور پر رہتا تھا۔ ان کے عہد کے اہل علم و فضل وکمال کا یہ لباس اور وضع تھی۔ انیس اپنی وضع پر اتنی سختی سے پابند تھے کہ ایک بار حیدرآباد میں سرسالار جنگ مرحوم مدارالمہام وزارت بھی جب ان کو سننے کے متمنی ہوئے لیکن یہ شرط لگا دی کہ سر پر حیدرآبادی ٹوپی یا ننگے سر ہوں تب ہی میں انیس کو سن سکتا ہوں۔

لوگوں نے انیس سے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ سر پر عمامہ رکھ لیں یا
ننگے سر پڑھیں یہ مجلس غم ہے کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح صدر
اعظم بھی سن لیں گے.... لیکن انیس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور بولے
کہ میر انیسؔ تو یہی ٹوپی پہن کر مجلس پڑھتا آیا ہے۔ سر پر عمامہ رکھ کر یا
ننگے سر مجلس پڑھنا میرے لئے ممکن نہیں۔'' (ص: ۶۴،۶۳)

درج بالا اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انیس اپنی وضع، اپنی خو اپنے مزاج اور اپنی طبع کے کس قدر پابند تھے۔ حیدر آباد ہی نہیں لکھنؤ اور الہ آباد کی مجلسوں کے بھی مرقعے پروفیسر فضل امام نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچے ہیں۔ جن کی مدد سے انیس کی ذہانت، فطانت، حافظے، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کو بہ آسانی و بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

انیس کے عہد میں لکھنؤ کے مختلف محلوں میں اردو زبان کے مختلف لہجے تھے۔ ایسے میں میر انیس کو اپنے گھرانے کی زبان پر نہ صرف یہ کہ فخر تھا بلکہ وہ اپنے گھر کے لہجے میں کسی دوسرے لہجے کی آمیزش بھی پسند نہیں کرتے تھے اور نہ یہ پسند کرتے تھے کہ کسی کم لہجہ گھرانے کے لوگ ان کے گھر کی زبان کو اپنے لہجے سے آلودہ کریں۔ لوگ خاندان انیسؔ کے شعراء کے کلام کی نقلیں لینے خاص طور سے میر مونسؔ کے پاس آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار میر مونسؔ کی ایک غزل ایک نواب صاحب کے ذریعہ کسی طائفہ دار تک پہنچ گئی اور چوک میں تحسین علی خاں کی مسجد میں جاتے ہوئے میر انیسؔ نے وہ غزل سن لی تو گھر پہنچتے ہی میر مونسؔ پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''غضب ہے کہ میر خلیق کے گھرانے کی زبان طائفہ داروں کے گھر پہنچے۔'' اس پر جب میر مونسؔ نے اپنی لاعلمی کا عذر کیا تو میر انیسؔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے: ''تو

کیا میں اب اپنے گھر کی زبان بھی بھول گیا ہوں؟'' یہ واقعہ بھی زبان کے تئیں میر انیسؔ کی احتیاطوں کو سمجھنے کے لئے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

خاندانی روایات، خرد و بزرگ کا پاس، رشتوں کا رکھ رکھاؤ اور آداب مجلس کے جملہ پہلوؤں کو پروفیسر فضل امام نے پیش نظر رکھا ہے اور قطرے سے گہر ہونے تک انیسؔ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ انیسؔ کی شاعرانہ تعلّیوں کے پیش نظر ہمارے اکثر نقادوں نے انھیں مرزا دبیرؔ کا حریف ٹھہرایا ہے اور یہ تصور کیا ہے کہ میر انیسؔ نے اپنی تعلّی کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ مرزا دبیرؔ کو حریف سمجھ کر کہا ہے جب کہ ایسا قطعی نہیں ہے۔ انیسؔ کو تو اپنے فن کا بھرپور عرفان تھا۔ انھوں نے جو کہا ہے وہ ان کے عرفان ذات کا مظہر ہے۔ میر انیسؔ مرزا دبیرؔ کے حریف نہیں بلکہ خیر خواہ تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح ہمارے بعض ناقدین انیسؔ کی تعلیوں کو صرف اور صرف ان کے غرور اور انا سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ انیسؔ کی شاعرانہ تعلیوں میں ہی انیسؔ کے مزاج کا انکسار بھی موجود ہے۔ جس کا مکمل ثبوت ان کی یہ بیت ہے۔:

ہم خوش ہوئے کہ مدح کے دریا بہا دئے
کیا ہو گیا جو بحر میں قطرے ملا دئے

علمی میدانوں میں مطالعے اور مشاہدے کے ساتھ ہی قوت استدلال کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پروفیسر فضل امام کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کے یہاں استدراک اور استدلال کی بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں۔

کتاب کا تیسرا باب انیس کی مرثیہ نگاری کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کے ۱۶۶ صفحات پر مشتمل ہے کتاب کے اس بنیادی باب میں انیس کے شعری

محاسن کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ابتدا میں مرثیہ نگاری کی صفات، خصوصیات، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر مرثیے پر کیے گئے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ خاص طور سے کلیم الدین احمد، احسن فاروقی اور اظہر علی فاروقی کے اعتراضات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور پھر انیسؔ کی زبان، بیان، لفظیات، لسانیات، اخلاقیات، جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، رزمیہ عناصر اور ہندوستانی عناصر کی بحثیں قائم کی گئی ہیں۔ یہ سارے مباحث قاری سے پروفیسر فضل امام کے تنقیدی محاکمے کی بھرپور صلاحیتوں کا اعتراف کراتے ہیں۔

کردار نگاری کی بحث کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے زوجۂ یزید ہند کے کردار کا مراثی انیسؔ کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ منظر نگاری کے حوالے سے پروفیسر فضل امام کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:۔

> ''عام طور سے منظر نگاری کے سلسلے میں صرف یہ تصور ہے کہ الفاظ کے ذریعے کسی منظر قدرت کی تصویر کھینچ دی جائے لیکن ایسا نہیں ہے۔ منظر نگاری کو صرف مناظر قدرت کی تصویر کشی تک محدود کر دینا تصور کی بے کراں وسعتوں اور مشاہدوں کے لا محدود امکانات کے ساتھ ناانصافی ہے کیوں کہ مناظر قدرت خارجی مظاہر ہیں اور اخلاقی شاعر کے تصور کی گہرائی اور گیرائی صرف ان خارجی مظاہر کی تصویر کشی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ میر انیس کی منظر نگاری اس تنوع پسندی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔'' (ص: ۱۹۳)

کتاب کا چوتھا باب انیسؔ کی رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے رباعی کی بحر، ہیئت اور موضوعات پر تفصیل

سے روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ مرثیہ گویوں نے یہ اصول وضع کر لیا تھا کہ وہ مرثیے سے پہلے سلام اور سلام سے پہلے رباعیاں پڑھ کر مجلس کی فضا بندی کرتے تھے۔ لہٰذا اردو میں رباعیوں کا اتنا بڑا قابل قدر ذخیرہ مرثیہ گو شعرا کے سبب سے ہی جمع ہو سکا ہے۔ اور پھر انیس کی معتدد رباعیوں کے جائزے سے ثابت کیا ہے کہ انیس کو اگر مرثیے میں تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون کو پھیلانے میں ملکہ حاصل تھا تو وہ رباعیوں میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ نہایت گہرے اور فلسفیانہ مسائل کو پیش کرنے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔ پروفیسر فضل امام کے بقول:

> ''انیس نے رباعی کو صرف سنجیدہ اور مہذب شاعری کا نمونہ ہی بنا کر نہیں پیش کیا بلکہ کائنات اور اس کے متعلقہ مسائل پر عالمانہ طور پر اظہار رائے کے قابل بنا دیا۔ اگر ان کی رباعیات ایک طرف شاعری کا بہترین نمونہ ہیں تو دوسری طرف فلسفیانہ خیالات کا قابل قدر ذخیرہ ہیں۔'' ص: ۲۸۵

کتاب کا پانچواں باب انیس کی سلام نگاری اور قطعات نگاری پر مشتمل ہے۔ انیس کے سلام بھی اپنی انفرادی شان رکھتے ہیں۔ پروفیسر فضل امام نے انیس کے سلاموں کے حوالے سے بہت سے تحقیقی مسائل اٹھائے ہیں۔ آج بھی انیس کے بہت سے کلام بکھرے ہوئے ہیں ان پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انیس نے الگ سے قطعات نہیں کہے ہیں لیکن ان کے سلاموں میں ہی بہت سے قطعہ بند اشعار موجود ہیں۔ پروفیسر فضل امام نے انیس کے سلاموں سے ایسے قطعات کا ایک انتخاب پیش کر دیا ہے، جو انیس کی قطعہ نگاری کو سمجھنے میں بہر حال معاون ہوں گے۔

کتاب کے آخر میں خلاصۂ کلام اور کتابیات کی فہرست شامل ہے۔

مجموعی طور سے پروفیسر فضل امام کے ادبی کاموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرثیے اور انیسؔ سے انھیں روحانی وابستگی ہے۔ حالانکہ مرثیے اور انیسؔ پر پروفیسر فضل امام سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن وہ اس میدان میں کسی سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر پوری ادبی دیانت کے ساتھ اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ انیسؔ کے مرثیوں کے تنقیدی تجزیوں سے پروفیسر فضل امام کی وسعت مطالعہ، دقت نظر، عمیق نگاہی اور عرق ریزی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو میں ڈی۔ لٹ کے لئے تحقیقی و تنقیدی مقالے تو بہت سے لکھے گئے ہیں لیکن پروفیسر فضل امام کے مقالے ''انیس شخصیت اور فن'' نے جس طرح اپنے زمانے کے نامور ادیبوں اور دانشوروں سے داد و تحسین حاصل کی اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس مقالے کے حوالے سے پروفیسر محمد حسن اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''اردو تنقید نے ہنوز انیس کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی تصنیف میں انیس کے فن کا نئے زاویے سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔ تعصبات اور تاثرات کو صرف رائے زنی کے طور پر رنگین جملوں اور چٹ پٹے فقروں میں بیان کرنے کے بجائے وہ سنجیدہ مطالعے کے عادی ہیں اور اپنے خیالات کو دلیل اور ثبوت سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ انیس کے وکیل نہیں بلکہ ایک باذوق قاری اور ایک ذمہ دار نقاد کی طرح انیسؔ کا مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے کے ''انیس شخصیت اور فن'' کی اہمیت و معنویت کا اعتراف معروف کے سامنے پیش کرتے ہیں۔''
>
> (فلیپ: انیس شخصیت ارو فن)

''انیس شخصیت اور فن'' کی اہمیت و معنویت کا اعتراف معروف نفسیاتی نقاد پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی ان جملوں کے ساتھ کرتے ہیں:۔

''زیرِ نظر مطالعہ ڈاکٹر فضل امام کے خوشگوار تنقیدی شعور و اسلوب کا حاصل ہے۔انھوں نے میر انیس کی فنکاری کا جائزہ نہایت جامع سیاق و سباق میں لیا ہے اور نہ صرف ان کے معنوی نہاں خانے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے بلکہ لفظیات کے بیرونی نگار خانے پر بھی باخبری کی نگاہ ڈالی ہے۔پردۂ ساز کا کہرام، شمشیر کی جھنکار، دامن صحرا پر موتیوں کی لرزش، پر طاوس کی قلم کاری، خون شہدا کی شفق، مرثیت کا آب زلال اور پھر تاریخ روایت کا انتہائی پیچیدہ سلسلۂ خیر و شر، میر انیس کی فنکاری کے بنیادی اور علامتی اجزا سمجھے جاتے ہیں۔ڈاکٹر فضل امام نے ان سبھی نکات پر بصیرت خیز نظر ڈالی ہے اور میر انیسیات کے سرمائے میں ایسی توسیع کی ہے جو قابل دید و داد ہے۔''

(فلیپ: انیس شخصیت اور فن)

بلاشبہ ''انیس شخصیت اور فن'' انیس شناسی کے میدان میں پروفیسر فضل امام کا ایک یادگار تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ادبی دنیا ان کی تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرتوں کی قائل ہے۔انھوں نے اس وقیع مقالے کے علاوہ انیسیات کے حوالے سے جو کام کئے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔یہ بھی واضح رہے کہ اردو کے تنقید نگاروں نے میر، غالب، اور اقبال کے شعری امتیازات کو جس طرح نمایاں کیا ہے، انیس کے اوپر

اس طرح کا شایان شان کام ہونا ابھی باقی ہے۔ بلاشبہ پوری دنیا میں انیسؔ سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں لیکن تنقید کی میزان پر ان کے کلام کو ابھی اس طرح نہیں لایا گیا ہے جس کے وہ حق دار ہیں۔ اردو تنقید انیس شناسی کے حوالے سے بہر حال قرض دار ہے۔ پروفیسر فضل امام نے ''انیس: شخصیت اور فن'' جیسا جامع مقالہ تصنیف کر کے اس قرض کو ادا کرنے کی قابل ستائش سعی کی ہے۔ امید ہے کہ پروفیسر فضل امام کے بعد آنے والی نقادوں کی نئی نسل انیسیات پر مزید کام کرے گی اور انیس کی فکر وفن کے مختلف ابعاد وامکانات کو مزید روشن کرے گی۔ ابھی انیسؔ پر بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے لیکن آئندہ بھی جو کچھ لکھا جائے گا ان میں پروفیسر فضل امام رضوی کی کتاب ''انیس شخصیت اور فن'' کو بنیادی حیثیت حاصل رہے گی۔

ڈاکٹر ارشد رضوی

پروفیسر فضل امام کی تنقیدی بصیرت
(امعانِ نظر کے آئینے میں)

دورِ حاضر میں ہماری اردو تحقیق و تنقید کی تاریخ میں پروفیسر فضل امام رضوی ایک معتبر نام ہے۔ معتبر اس لحاظ سے کہ اُن کی اساس فکر و نظر ادبی تخلیق کی تشریح، تصریح، تفہیم و توضیح میں گہری معنویت سے عبارت ہے۔ وسعت مطالعہ و مشاہدہ عمیق تنقیدی شعور کے ساتھ تخلیق کو نہ صرف اعتبار بخشتی ہے بلکہ قاری کی مکمل تسکین کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔ تنگ نظری، علاقائی عصبیت اور حلقہ بگوشی سے بلند ہو کے جب بھی پروفیسر فضل امام رضوی کی تنقیدی کاوشوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کی صاحب نظری اور تنقیدی بصیرت کا احساس جا بجا نظر آئے گا۔

یوں تو ہماری تنقیدی روایت تذکروں سے ہوتی ہوئی موجودہ دور تک نہ جانے کتنے نشیب و فراز طے کر چکی ہے۔ جس میں تاثراتی، جمالیاتی، تقابلی، مارکسی، ترقی پسند اور نفسیاتی دبستان قائم کئے گئے اور ادب کو نظریوں کے ترازو پہ تول کے جانچا اور پرکھا گیا۔ دبستانوں کے بننے اور بگڑنے کا عمل آج بھی اسلوبیات، ساختیات پس ساختیات، تعمیر و رد تعمیر کی اصطلاحوں کے ساتھ جاری ہے۔ اردو ادبیات کو اصول و نظریات کے تحت جانچنے کے کے لیے یہ اصطلاحیں مغرب کے

ارباب فکر ونظر کے بنا کردہ اصول سے اردو میں شامل کی گئیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر زبان کا ادب اپنے تاریخی، تہذیبی، معاشرتی اور جغرافیائی ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے اُسے اُن کے دائرے میں جانچا اور پرکھا جانا مناسب ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جن صاحبان نقد نے مغرب کی کوری تقلید کے ساتھ مشرقی ادب اور خاص طور سے اردو ادبیات کا مطالعہ کر کے نتیجہ نکالنے کی کوشش کی وہ فن اور فنکار کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ اُن کا قاری تخلیق کی تفہیم میں اس قدر اُلجھ گیا کہ ادب اس کے لیے ایک معمہ بن گیا۔ لیکن اردو تنقید کی تاریخ میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جنھوں نے مغربی مفکرین کے نظریات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور اردو ادبیات کو سمجھنے کے لیے خود اصول ونظریات قائم کیے اور اپنی تبحر علمی، وسعت مطالعہ، فکر و آگہی سے اردو تنقید کو اس منزل پر پہنچا دیا جہاں مغربی مفکرین وناقدین تنقید کو لے گئے تھے۔ اُن میں پروفیسر احتشام حسین کا نام سرفہرست ہے۔ احتشام حسین کی قائم کردہ شاہ راہوں پہ چل کر اُن کے بعد آنے والے صاحب نظر قلم کاروں نے تنقید کو جلا بخشی۔

پروفیسر فضل امام رضوی کی تنقیدی کاوشوں پر بھی احتشام حسین کے طرز تنقید کا گہرا اثر ہے۔ اگرچہ پروفیسر فضل امام کسی مخصوص مکتب فکر یا نظریہ سے منسلک ہو کے ادب کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اپنا ذاتی اور منفرد تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ تنقید کی تعریف اور مقصد ان کے ذہن میں واضح ہے۔ وہ تنقیدی کاوشوں کو تخلیقات کے مرتبے میں دیکھنے کے قائل ہیں اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ :

> ''دراصل تنقید کے معنی محاکمے کے ہیں اس لیے تنقید نگار وہ ہوتا ہے جو کسی ادبی تخلیق کے محسنات ومعائب پر غائر نظر ڈال کر کوئی رائے پیش کرتا ہے۔ تنقید ادبی محاکمے کے ساتھ اس جوہر کی بھی

آئینہ دار ہوتی ہے جس سے ادب کو توانائی اور رعنائی حاصل ہوتی ہے لہٰذا تنقید کو تخلیق کا درجہ بھی دیا جانا چاہئے۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے اُن کا تنقیدی مطمح نظر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تنقید میں فقط نظریاتی اور فکری جوہر کے ہمنوا نہیں بلکہ اسلوب کی فنی مہارت اور زبان و بیان کے حسن کو بھی پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پروفیسر فضل امام کا تنقیدی شعور واضح ہے۔ وہ ادبی تخلیق کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد، معاشرتی و لسانی نظام، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں پر نظر غائر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی نظر میں ادب کو اعلیٰ انسانی و معاشرتی قدروں کا امین ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں کہ :

> "یہ بات بالکل واضح اور بالکل قطعی ہے کہ کسی زبان کے ادبی سرمایہ کو پرکھنے کے لیے اس کے نظام نسبتی کی حدود میں ہی جانا چاہئے کیونکہ اس ادب کے اپنے متعلقات اور خاص طور سے معاشرتی اور ثقافتی پہلو کے مضمرات اور انسلاکات ہوتے ہیں۔ اگر کسی زبان و ادب کے شعری اور ادبی سرمائے کو اس زبان و ادب کے نظام نسبتی سے علاحدہ کر کے کسی دوسرے پیمانۂ انتقاد سے ناپیں گے تو جو بھی استخراج نتائج ہوں گے وہ بالکل غلط اور گمراہ کن ہوں گے۔"

پروفیسر فضل امام رضوی مشرقی ادب کے دلدادہ ہیں اگر چہ اُن کی نظر مغربی ادب اور ارباب فکر و فلسفہ کے نظریات سے بھی بخوبی واقف ہے، لیکن وہ اُن کی کوری تقلید کرنے کے مخالف ہیں بلکہ وہ تفہیم ادب میں اُن کو سہارے کے طور پر استعمال کرنے کے قائل ہیں کیونکہ مشرقی ادب کے اپنے الگ مضمرات و مطالبات ہیں۔ اُن

کے خیال میں نقاد کو وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ جس ادب کی تفہیم میں منہمک ہو اس زبان و ادب سے گہرے فکری و فنی شعور کی علم و آگہی ہونا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''نقاد کے لیے صرف ہمدرد بے لوث اور باشعور ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اصول نقد اور اصول شعر وسخن و ادب سے بھی باقاعدہ طور پر واقف ہو۔ اس کے علاوہ اپنے عہد کے مروجہ علوم و فنون پر بھی اس کی گہری نظر ہو۔''

پروفیسر فضل امام تنقید کے لیے وسعت مطالعہ، متن کی گہری سمجھ، مشرقی ادبیات کی تفہیم کے لیے عربی فارسی و دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ عالمی ادب پر گہری نظر رکھنے اور محنت شاقہ کے قائل ہیں دورحاضر کی تنقید میں ان باتوں کے فقدان کو محسوس کرتے ہیں تو ان کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آج کی تنقید ہوا میں قصر تعمیر کر رہی ہے۔ ''امعانِ نظر'' کے دیباچے میں وہ اسی تلخی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ''ادھر کچھ دنوں سے تنقید، تحقیق اور تدریس بھی کے معیار رو بہ زوال ہیں اور نئے نئے موضوعات و عناوین کا پرچار بڑی چابکدستی سے کیا جا رہا ہے۔ لاتشکیل، مابعد جدیدیت، نئی تاریخیت اور پھر تانیثیت کے موضوعات بڑی سرعت سے سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ دریدہ، روڈلنگا شے، خراں فرانکوئز، لیوراڈو، اینڈ ریس ہیو، ڈیوڈ ہاروے، جولی رفکن اور مائکل ریان، شوشانا فیلمن کے ناپختہ اور مشکوک نظریات کے اُگلے نوالے چبانے والے ہماری ادبی تنقید کی

تفہیم وتشریح کو خواہ مخواہ معما بنا رہے ہیں، میں مغربی نظریات اور انتقادی کاوشوں کا منکر نہیں لیکن جوں کا توں بغیر تفہیم وتعبیر کے ترجمہ وہ بھی لفظ بہ لفظ پیش کر دینے کو میں نظریہ سازی نہیں سمجھ سکتا بلکہ ایک طرح سے اردو داں طبقے کو گمراہ کرنا قرار دیتا ہوں۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروفیسر فضل امام رضوی مغرب کی کورانہ تقلید کو تنقید کے لیے مہلک اور گمراہ کن خیال کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا تنقیدی شعور جن افکار و خیالات سے عبارت ہے اس کا ذکر ان کی تحریروں کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں ہر کس و ناکس تنقید کا حقدار نہیں بن سکتا بلکہ وسعتِ مطالعہ اور گہرے فکری اور فنی شعور اور علم و آگہی سے ہی صحت مندانہ اور مفید تنقید اردو ادبیات کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں بقدر ضرورت ہی مغرب سے استفادہ کیا ہے۔ وہ مشرقی تنقید کے اصول و نظریات مشرقی بنیادوں پر ہی وضع کرتے ہیں اور ادبیات کی تفہیم و تصریح انھیں افکار کی روشنی میں کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی کاوشوں میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ بلکہ بہت واضح اور دوٹوک رائے سامنے آتی ہے۔ ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کے مثبت اور مفید پہلوؤں کو وہ اپنی تنقید میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ اس ادب کی ستائش کرتے ہیں جو اعلیٰ انسانی قدروں کا امین ہو اور جس میں روشن مستقبل کی بازگشت ہو۔ وہ حقیقت نگاری میں فحاشی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ تنقید کے حوالے سے فضل امام کا تنقیدی شعور بالکل واضح اور صاف ہے۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے پروفیسر فضل امام کا ادبی سفر ''امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری'' سے شروع ہوتا ہے اور اب تک تحقیقی تنقیدی اور تاریخی کتب کی

شکل میں پروفیسر فضل امام رضوی کی تقریباً دو درجن ادبی کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جس میں اردو نظم ونثر کے ہر گوشے پر مضامین سپرد قلم کئے گئے ہیں جو اُن کے وسیع علمی وادبی مطالعہ کے امین ہیں۔ اگر چہ ہر صنف کے شاعر وادیب کا فن فضل امام صاحب کی نکتہ داں نظر سے پوشیدہ نہیں لیکن اقبالؔ جوشؔ اور میر انیسؔ پر تحقیق وتنقید کے حوالے سے گہرے مطالعہ مشاہدے اور فکری وفنی شعور کے ساتھ ان کے قلم نے تفہیم وتجزیہ کے جوہر دکھائے ہیں۔

۱۸ تنقیدی مضامین پر مشتمل اُن کا مجموعہ ''امعانِ نظر'' بھی اُن کی تنقیدی بصیرتوں کا آئینہ دار بن کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعے میں غزل، نظم، افسانہ، مرثیہ اور تنقید کے موضوع پر قابل قدر تنقیدی مضامین سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ غزل کے حوالے سے جن شعرا کے کلام کا تجزیہ کیا گیا ہے، ان میں اکبرؔ الہ آبادی، میر تقی میرؔ اور مجروحؔ شامل ہیں۔ اگر چہ ان شعرا کے کلام کو عنوان کے تحت جانچا اور پرکھا گیا ہے اس لیے تنقید کا رُجحان اُسی پہلو پر ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی کے کلام کا تجزیہ انتہائی نفسیاتی مطالعہ کے ساتھ ہے۔ جس میں اکبر کے فکر وفلسفہ اور مشرقی اقدار حیات کے تحفظ کی سعیٔ کا جائزہ ہے۔ پروفیسر فضل امام نے اکبر کی شاعری میں اُن کی ذہنی کشمکش کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے۔ مشرقی معاشرت سے اُن کی وابستگی اور مغربی تہذیب سے ان کی دلدادگی کا تجزیہ اکبرؔ کے ماحول اور ذہنی ارتقاء کو پیش نظر رکھتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اکبرؔ کو مشرقی تہذیب وطرز حیات بہت عزیز تھے مگر وہ مغربی اور انگریزی تعلیم کے بھی مخالف نہیں تھے۔ بلکہ دونوں کے توازن کے قائل تھے۔ فضل امام اکبرؔ کی اسی نفسیات کا مطالعہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :

"اکبر قدیم و جدید معاشرت کے تصادم سے ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔

ہماری تہذیبی زندگی کی مختلف شکلیں اُن کے سامنے مسخ ہو رہی تھیں اور وہ حسرت و یاس سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک ذہنی جنگ میں مبتلا تھے۔ سرسید اس نئی تہذیب کے نمائندے تھے جو اکبر کے مشرقی اعتبارات کو مجروح کر رہی تھی۔"

مثال کے طور پر اکبر کے مندرجہ ذیل اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ سب نے دیے حد سے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ دُھن ہے کہ ساقی صراحیٔ مے لا
اُدھر ہے دفترِ تدبیر مصلحت ناپاک
اِدھر ہے وحیِ ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا

سرسید کے مخالفین میں اکبرالہ آبادی کا نام سرفہرست ہے لیکن اکبر سرسید کے کیوں مخالف تھے کیونکہ وہ سرسید کو نئی تہذیب یا مغربی تہذیب کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ پروفیسر فضل امام نے اپنے مضمون میں اکبر کی اسی ذہنی کشمکش کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے

جس کی اور بہت سی مثالیں مضمون میں درج ہیں۔ چونکہ اکبر کے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں زیادہ عزیز تھیں جدید تہذیب اُن قدروں کی پامالی کا سبب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے بے راہ رو انگریزی تعلیم کی مخالفت کی جو مشرق اقدار حیات کی نفی کرتی ہو۔ اکبر کا مطالعہ کرتے وقت تنقید نگار نے اُن کے ماحول اور نفسیات کا بھرپور مطالعہ کر کے جو نتائج اخذ کیے وہ یہ ہیں وہ لکھتے ہیں کہ :

''اکبر حیات میں اعتدال اور توازن قائم رکھنا چاہتے تھے۔ تعلیم کی قدر و قیمت سے وہ بخوبی واقف تھے لیکن ایسی تعلیم کے مخالف تھے جو اُن کی مشرقی قدروں کو پامال کر دے۔''

پروفیسر فضل امام نے اپنے اس مضمون میں اکبر کی ابتدائی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے اُن کے مشرقی مزاج کی تعمیر اور اُن کی فکر کا مطالعہ گہرے تنقیدی شعور اور نفسیات کے آئینے میں کیا ہے۔ جس سے اکبر کے فکر و فن کا خاکہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اگرچہ غزل کی رمزیت و ایمائیت یا اس کے شعر سے بحث نہیں کی ہے کیونکہ عنوان مشرقی اقدار حیات کی قدر و قیمت ہے۔ بلکہ انھوں نے اکبر کے دور کے سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی اور تمدنی پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے کیونکہ اکبر کی شاعری کے بیشتر موضوعات میں انھیں باتوں کا فکری میلان ہے۔

اکبر کے تجزیہ میں انھوں نے اس بات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ ایسا نہیں کہ اکبر مشرق کی خامیوں کو بھی پسند کرتے تھے بلکہ انھوں نے اپنی طنزیہ شاعری میں اُن خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس تجزیہ میں تنقید نگار تحریر کرتے ہیں کہ:

''اکبر مشرق کے تہذیبی و تمدنی افکار کے نقیب تھے اور ہر چیز مغرب سے وابستہ کرنے کو غلط سمجھتے تھے۔ بلکہ مشرق کا بھی انسانی

زندگی کو پُر وقار بنانے میں گراں قدر حصہ ہے۔ اکبر مشرق کے دلدادہ تھے لیکن مشرق کی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے بلکہ ایک غیر جانب دار مبصر کی طرح بھرپور تبصرہ کرتے تھے۔ یہی بے لوث انداز اُن کی شاعری کی روح بھی ہے اور کامیابی کی دلیل بھی۔“

اس طرح اکبر کے فکری اور ذہنی میلان کا ایک بھرپور خاکہ ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے۔ اردو کی غزلیہ شاعری کے حوالہ سے میر کا مطالعہ بھی فضل امام رضوی کے گہرے تنقیدی شعور میں رچا بسا ہے۔ ایک مختصر سے مضمون میں میر کی شاعری اور اس کے نمائندہ پہلوؤں کو سامنے لانا کوزے میں سمندر بند کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ مضمون بھی میر کی شاعری کے نفسیاتی، معاشرتی، تاریخی اور فنی زاویوں پر گہرائی سے نگاہ ڈالنے کا غماز ہے۔ اسی رجحان کے ساتھ میر کے مطالعہ میں اعلیٰ انسانی قدروں کی تلاش اور صلح کل کے پیغام کی بات پروفیسر فضل امام رضوی نے مدلل انداز میں پیش کی ہے۔ اُن کے نزدیک میر کی شاعری سادہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر نہ جانے کتنے جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے۔ میر کے فکری اور فنی دونوں پہلوؤں پر تنقید نگار کی نگاہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

”اس کی شاعری سہل ممتنع ہونے کے بعد بھی بہت پیچیدہ ہے اس لیے کہ اس کی شاعری کی اصل روح رمزیت و ایمائیت میں مضمر ہے۔ میر کا فن بہت تہہ داری کا امانت دار ہے جس کی تہوں میں تہیں بہت سی زیریں لہریں رکھتی ہیں۔“

پروفیسر فضل امام کی تنقید جہاں گہرے فکری اور فنی شعور کا پتہ دیتی ہے وہیں ان کا اسلوب تنقید کو تخلیق کی منزلوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

مجروحؔ کی غزلوں کا جائزہ بھی صاحبِ ''امعانِ نظر'' نے اس عہد کے ادبی تقاضوں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے لیا ہے اور اردو غزل کے قدیم و جدید رموز و علائم کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے جو تنقید کے مثبت رجحان کا غماز ہے۔ غزل کے مطالبات اور اس کی تنقید کا گہرا مطالعہ فضل امام کے زیرِ نظر ہے۔ اس صنف نے وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح اپنے لہجے میں تبدیلیاں کیں اس پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ اُن کی نظر میں مجروحؔ نے اقبالؔ اور فیضؔ سے کسبِ فیض کرتے ہوئے اپنے لیے زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ تنقید نگار نے پوری دلیل اور بے باکی سے دوٹوک انداز میں مجروحؔ کے اس دعوے کو خارج کیا ہے کہ ان کے موضوعات اچھوتے ہیں۔ انھوں نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ قدیم علامتوں کو جدید رنگ سے پیش کش اقبالؔ و فیضؔ کے اثر سے مجروحؔ میں آئی ہے۔ یہاں بھی پروفیسر فضل امام کا تنقیدی شعور مشرقی انتقادیات کے ساتھ مغربی نقد و نظر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے لیکن مفید نتیجہ خیزی کی حد تک کیونکہ اُن کا تنقیدی رجحان اور نظریہ بھی اسی جانب مائل ہے۔

غزل کے علاوہ نظم میں اخترؔ شیرانی، کیفیؔ اعظمی، چکبستؔ، اور جوشؔ کی شاعری پر تنقید اُن کے عہد کے سماجی، تاریخی اور سیاسی آئینے میں بہ نظرِ غائر کی گئی ہے۔ یہاں بھی پروفیسر فضل امام کا تنقیدی شعور اُن کے اسی نظریہ کے تحت آگے بڑھا ہے جس میں وہ تنقید میں نقاد کے لیے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ اصول نقد و اصول شعر و سخن و ادب سے باقاعدہ طور پر واقف ہو اور اس کے علاوہ اپنے عہد کے مروجہ علوم و فنون پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فضل امام جب پر کسی صنفِ شعر یا اس کسی شاعر کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس صنف کے فکر و فن پر گہری نگاہ ڈالنے کے بعد ہی فن پارے کے حسن و قبح پر بحث کرتے ہیں اس سے تنقید نگار کے شعور اور مطالعہ کا احساس تو ہوتا ہی

ہے۔ ساتھ ہی نتیجہ خیزی سے شاعر و ادیب کے فن کی اہمیت و افادیت میں بھی بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کی ڈرامہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے ڈرامہ نگاری کے فن اصول ضوابط کو نگاہ میں رکھ کے کردار و مکالمہ کی اہمیت و افادیت کو واضح کر کے بحیثیت ڈرامہ نگار احتشام حسین کے ادبی مرتبہ کو پیش کیا ہے۔ فنکار کے ذہن کا نفسیاتی اور فنی مطالعہ کرتے ہوئے فن پارے کا رشتہ معاشرت، عہد اور سیاست سے مربوط کیا ہے جس سے فن اور فنکار کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔ اسی طرح پریم چند کے ناولوں افسانوں اور ممتاز مفتی کے افسانے ''آپا'' کا مطالعہ بھی گہری تنقیدی بصیرت کے ساتھ نفسیاتی، معاشرتی، فکری اور فنی بنیادوں پر کامیابی کے ساتھ نتیجہ خیز تجزیہ سامنے آیا ہے۔ کیونکہ تنقید نگار نے فن کی معنوی اور فنکار کے ذہنی ارتقا کا جائزہ اس کے تاریخی، سماجی اور جمالیاتی منظر نامے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح ''امعان نظر'' کے دیگر مضامین ''سجاد ظہیر کا لسانی ادراک''، ''دبیر شناسی اور تقی عابدی'' میں جمالیاتی بنیادوں پر تنقید و تجزیہ مختلف اسالیب نقد پر گہری نظر کا پتہ دیتے ہیں جس سے تنقید نگار کی تنقیدی بصیرت و بصارت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

موجودہ دَور کے اردو ادباء و ناقدین میں شاید فضل امام رضوی واحد ایسے ادیب و ناقد ہیں جن کی ہندی شعر و ادب پر بھی گہری نظر ہے۔ یوں تو علاقائی ادب میں بھوجپوری اور راجستھانی ادب پر اُن کا قابل قدر کام منظر عام پر آچکا ہے لیکن ''امعانِ نظر'' میں بھی شامل مضمون ''کبیر ایک مطالعہ'' کبیر داس کے فکری میلان، اعلیٰ انسانی قدروں اور حق آگاہی پر گہرے مطالعہ کے ساتھ قلم فرسائی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی انسان دوستی، خدا ترسی اور خدا شناسی اور فکر و فلسفہ کی نشاندہی بھی گہرے مشاہدے اور

وسیع مطالعہ کی غمازی کرتے ہیں۔

''امعانِ نظر'' میں شامل پروفیسر فضل امام کی تنقیدی بصیرتوں پر مبنی ایک اور صنف سخن یعنی جدید مرثیہ گوئی کا اجمالی جائزہ ہے۔ اگر چہ اسی عنوان سے اُن کی تصنیف کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آگئی ہے۔ شاید اس مضمون کے بعد ہی انھیں احساس ہوا ہوگا کہ یہ صنف اتنی وسعت کی حامل ہے کہ صرف ایک مضمون سے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا اس لیے اردو کی جدید مرثیہ گوئی کا جائزہ قدرے تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ مضمون اس کا خلاصہ ہے۔ جس میں جوش ملیح آبادی سے لے کر عہد حاضر کے مرثیہ نگاروں کے مراثی کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جدید مراثی حق بینی، حق شناسی، جذبۂ حریت، فکر و فلسفہ تاریخ اور اعلیٰ انسانی قدروں کے مضامین سے مملو ہیں۔ ساتھ ہی اس کے جمالیاتی، معاشرتی، تاریخی، ثقافتی، تہذیبی و تمدنی اور سیاسی پہلوؤں کو بھی پروفیسر فضل امام کی دور بین، فن شناس اور عمیق نگاہوں نے جانچا اور پرکھا ہے اور استخراج نتائج سے اس کی ادبی اہمیت وافادیت کو واضح کیا ہے۔

مرثیہ انیسؔ و مرزا دبیرؔ کی فنی و شعوری کاوشوں سے ادب کی ایک ایسی صنف سخن ہو گیا کہ ہر بڑے نقاد نے اُسے اپنی تنقید کا موضوع بنانا ضروری سمجھا اور اپنے اپنے فکری اور مخصوص نظریات کے تحت اس صنف کی فنی، معاشرتی، تاریخی اور مذہبی اہمیت اور حسن و قبح کو جانچا اور پرکھا ہے۔

پروفیسر فضل امام رضوی نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی سے ہی اس صنف کی جانب خاصی توجہ کی اور قابل قدر تصانیف سپرد قلم کیں۔ جس میں ''انیس شناسی'' ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ ترتیب و مقدمہ'' ''انیس شخصیت و فن'' اور مختلف مضامین کے علاوہ

اب جدید مرثیہ نگاری۔ اس صنف کی ادبی خوبیاں، سماجی و معاشرتی انسلاکات، لسانی و جمالیاتی حسن نیز فکر و فلسفہ کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا اور قابل قدر نتائج بر آمد کئے۔

پروفیسر فضل امام کا شمار ہمارے ادب کے سربرآوردہ ناقدین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے تبحر علمی، عمیق مشاہدہ اور وسعت مطالعہ سے اردو تنقید کی تاریخ میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ اگر چہ اُن کا طرز نقد کسی ایک مکتب فکر سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فن اور فنکار کی ادبی حیثیت کے تعین میں انھوں نے ہر ایک مثبت اور مفید اصول و نظریات سے کام لیا لیکن اُن کی تنقید پر دبستان احتشامی کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ احتشام حسین کا منطقی طرز استدلال، اعلیٰ انسانی قدروں کی تلاش، انصاف پسند سنجیدہ اور متین اور سائنٹفک طرز تنقید رہی۔ کیونکہ سنجیدہ مطالعہ کرنے والے ہر انصاف پسند ادیب و ناقد نے کسی نہ کسی شکل میں احتشام حسین اور اُن کے تنقیدی نظریات سے اثر قبول کیا ہے۔ پھر بھی اردو تنقید میں مغربی نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے مشرقی اصول و نظریات کی تبلیغ و ترویج میں پروفیسر فضل امام نے اپنے قلم کو وقف کیا ہے۔ اپنے اسی رجحان کے تحت ان کے تنقیدی اصول و نظریات کے حوالے سے ''مشرقی انتقادیات اصول و نظریات'' تصنیف مشرقی ادب کے مطالعہ کے لیے نہ صرف مفید ہے بلکہ مثبت اور واضح نتیجہ خیزی کو مہمیز کرتی ہے۔

ڈاکٹر نریش

ڈاکٹر فضل امام بحیثیت شاعر

شاعری کو عام طور پر تفریح طبع کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سچی شاعری ہمیں اتنا لطف نہیں دیتی، جتنا جھنجھوڑتی ہے۔ دور حاضر کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی آئینے کے سامنے کھڑا ہونا نہیں چاہتا۔ ہم سب اپنے اپنے عیوب سے واقف ہیں لیکن کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہو۔ سچی شاعری ہمیں اندر سے جھنجھوڑ کر آئینے کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اب تک ہم خود کو کس قدر دھوکا دیتے رہے۔ یہ احساس بھی اگرچہ تمام تر کھرے احساسات کی طرح وقتی ہوا کرتا ہے لیکن بعض اشعار ایسے ہوا کرتے ہیں کہ جن کی چبھن ہم برسوں برسوں محسوس کرتے رہتے ہیں۔ یہ چبھن خود فریبی کی دھوپ میں کسی اڑتی ہوئی بدلی کے سائے کی طرح ہمارا ساتھ دیتی رہتی ہے اور ہم شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام اردو شاعری کے جس دور سے متعلق ہیں وہ دور ایسا ہی دور ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ یہ دور ہمارا اور آپ کا دور ہے اور ہم اور آپ خود فریبی کے المیہ سے گذر رہے ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام کے یہاں آپ کو دل بھی ملے گا، نگاہ بھی اور ذہن بھی۔ دل، جو حسن کا شیدائی ہے، جنون عشق کی انتہا دیکھنا چاہتا ہے، معشوق کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں رہنا چاہتا ہے، اس کے لب و رخسار کو چھونا چاہتا ہے، اس کے ستم کا شکوہ

کرتا ہے اور اس کی بے اعتنائی پر آہ بھی بھرتا ہے: نظر جو مناظر قدرت کا حسن بھی دیکھتی ہے اور چاند کے داغ کو بھی نظر انداز نہیں کرتی، جو حسن جاناں سے لپٹ لپٹ جاتی ہے مگر اپنے ماحول سے بے خبر بھی نہیں ہوتی: اور ذہن، جو امراض معاشرہ کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور ان کا علاج بھی تلاش کرتا ہے، جو اپنے دور کی غیر مساوی تقسیمِ زر سے پیدا ہوئی مشکلوں اور مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور جہدِ مسلسل کی شمع لے کر زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی بھی بکھیرتا ہے۔

اردو شاعری کے ساتھ ایک مجبوری یہ بھی رہی ہے کہ اردو کے اکثر شعرا شاعری کو خداداد چیز مان کر اس بھروسے پر بیٹھے رہتے ہیں کہ جب ان کا شعر کہنے کا موڈ ہوگا تب خود بخود شعر ان کے قلم سے جنم لیتے چلے جائیں گے۔ میں شاعری کو خداداد چیز ماننے کو تیار ہوں لیکن زبان کو خداداد نہیں مان سکتا۔ زبان انسان کی بنائی ہوئی چیز ہے قوت گویائی خداداد ہے، زبان نہیں۔ جب تک شاعر کا مطالعہ کمزور رہے گا تب تک اس کے اشعار بے جان رہیں گے۔ مطالعہ اور مشاہدہ کسی بھی شاعرانہ شخصیت کے دو لازمی اجزا ہیں۔ ان سے انحراف کرنا سچی شاعری سے انحراف کرنا ہے۔ جو کچھ Talent خداداد ہے وہ چند غزلوں، نظموں یا قطعات میں سما جائے گا۔ اس کے بعد جب تک شاعر کا مطالعہ اور اس کا مشاہدہ 'غیب' سے اس کے لیے 'مضامین' تلاش کر کے نہیں لائے گا تب تک وہ شعر 'لکھتا' تو رہے گا، 'شعر' کہہ نہیں پائے گا۔ دورِ حاضر کے جن شعرا سے مجھے اس قسم کی شکایت نہیں، فضل امام ان میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر نریش

صدر شعبۂ ہندی

پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ

ڈاکٹر عابدہ آفریدی
صدر شعبۂ اردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی
جے پور

پروفیسر فضل امام کی غزل گوئی

اس بات کا کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ استا محترم پروفیسر فضل امام نے شاعری بھی کی ہے۔ وہ اپنے راجستھان کے دورانِ قیام شعری نشستوں اور یہاں کے مشاعروں میں بڑے مقبول بھی رہے ہیں۔ یوں تو انھوں نے قطعہ، رباعی، نظم، نعت شریف اور منقبت کے ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں اور خوب خوب تغزل کے رنگ کو پیش کیا ہے لیکن اُن کی غزلوں میں فکروفن کا حسین امتزاج کچھ اس طرح نظر آتا ہے کہ امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ فکر کا عنصر زیادہ ہے یا فن کا۔ وہ غزل کے احساس کے آشنا ہیں۔ دراصل غزل ایک ایسی صف سخن ہے جس میں قاہری اور دلبری کے جلوۂ صد رنگ اپنی سج دھج دکھاتے ہیں۔ غزل کا فن لطیف جذبات و احساسات کا حامل ہوتا ہے۔

چاندنی رات میں چاند کے سامنے جب چوڑیاں کھنکتی ہیں، صبح کی پہلی کرن جب آبشاروں سے گلے ملتی ہے، اور دریاؤں کی گہرائیوں میں سیپیاں مسکراتی ہیں تب غزل بنتی ہے۔ زخموں کو سینوں میں چھپا کر مسکراتے رہنا اور غموں کو سہتے سہتے جب دردِ دل ایک مخصوص کسک پیدا کر دیتا ہے تو غزل میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ رگِ جاں میں

ڈوب کر جب کلک قلم میں ہلکی جنبش پیدا ہوتی ہے تو غزل تبسم ریز ہوتی ہے۔ درحقیقت غموں کے دھوئیں کو پی جانے کی سعیٔ مسلسل غزل بن جاتی ہے۔ اسی طرح کی غزل کے گیسوؤں کے سنوارنے میں فضل امام کی انفرادیت پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کون آئے گا یہاں کس کو صدا دی جائے
کیوں نہ آواز ہی سینے میں دبا دی جائے

....

سب عقل کی باتیں ہوتی ہیں جب ہوش میں انساں ہوتا ہے
اندازِ جنوں آ جاتے ہیں ، آباد بیاباں ہوتا ہے
کچھ اسکے بھی دل کی بات سنو، کچھ اپنے بھی دل کی بات کہوں
اے اہل خرد، اے ہم نفسو، دیوانہ بھی انساں ہوتا ہے

....

زہر بھی میں نے پیا ہے مئے گلفام کے ساتھ
دل میں اک درد ہے پوشیدہ ترے نام کے ساتھ

....

درج بالا اشعار میں اُن کا منفرد اندازِ سخن نمایاں ہے۔ وہ فکر وفن کے اتصال اور امتزاج سے پیرہن غزل کو سنوارنے کا ہنر جانتے ہیں۔ شاعری میں جذبات واحساسات کے بنیادی محرکات وعوامل ان کے یہاں کارفرما رہتے ہیں، ترقی پسندانہ افکار و نظریات کو غزل کے پیمانے میں بڑی خوبصورتی سے ڈھال دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں: ؎

اُن کا یہ حکم کہ سر کوئی اُٹھا کر نہ چلے
مجھ کو اِصرار کہ یہ رسم اُٹھا دی جائے

ہر غلط بات پہ کیوں ٹوک دیا ہے اُن کو
اِس خطا پر مجھے لازم ہے سزا دی جائے

....

دیوانے کے رونے ہنسنے پر کیوں اہلِ خرد ہیں دیوانے
فطرت ہے تماشہ میر اگر ہر لطف کا ساماں ہوتا ہے

....

شیش محل میں ڈھول بجا کر گاتے ہیں کچھ چرواہے
فن کی ریت انوکھی دیکھی آج کے ان فنکاروں میں

....

کس سے ناقدریٔ فن اہلِ ہنر جا کے کہیں
ایک سے ایک ابوجہل ہے کس کس سے لڑیں

....

وہ میرؔ تھے جنھیں فاقے میں سر بلندی تھی
یہ تم ہو جن کو خوشامد ہی اصل ہستی ہے

....

میں اپنے عہد کی تاریخ لکھنے والوں ہوں
مرے قلم کو حقیقت شناس رہنے دو

....

غزل کی روح اس کی رمزیت اور ایمائیت ہے۔ تہہ داری اس کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ غزل اسی نکات کو گہرائی سے پیش کرتی ہے جس سے حسن وعشق کی حدیث دل کش ایک نئی دُنیا سجا دیتی ہے۔ یہ تزئین دراصل لفظ ومعنی کے اختلاط اور ارتباط سے پیدا ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

عشرتِ بزم کا باعث ہیں یہی دیوانے
وشتِ وحشت میں کوئی آبلہ پا رہنے دو
عقل کہتی ہے کہیں دولتِ ایماں نہ لٹے
عشق کہتا ہے ستم گر کو خدا رہنے دو

....

یہ دل نواز نگاہیں غضب کی رہزن ہیں
نہ کامیاب ہوا کوئی دل بچانے میں

....

زندگی کشمکش غم ہے تمہیں کیا معلوم
چند لمحے تو گزارو کسی ناکام کے ساتھ
وقت کیا دے گا دلوں کو غم دوراں کے سوا
اک سلیقہ تو ہے جینے کا ترے نام کے ساتھ

....

درج بالا اشعار غزل کی رمزیت و ایمائیت کے ساتھ اس کی معنویت کی بھرپور نشاندہی کرتے ہیں۔ غزل چھوئی موئی سے بھی زیادہ نازک صنف سخن ہے۔ اس کے مزاج پر ترشی اور کرختگی گوارہ نہیں۔ یہ ریشم سے زیادہ نازک اور روئی سے زیادہ گداز ہے۔ حسن کی دلکشی، اس کے بانکپن میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ غزل کے گیسوئے خمدار اور تابناک کو سنوارنا آسان نہیں۔ یہ قدم قدم پر شاعر کے جذبات اور احساسات کا امتحان لیتی ہے۔ فضل امام صاحب کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

ہر منزل ادراک سے کھیلیں ترے وحشی
یہ تیری نگاہوں کا اشارہ بھی نہیں ہے

زُلفوں کا ترے رُخ پہ بکھرنا ہے قیامت
اب وقت کو کچھ اور گوارا بھی نہیں ہے

....

ہم اہلِ دل ہیں غم دل کی لاج رکھ لیتے
نگارِ حسن کو ہم شہرِ آرزو دیتے

....

مذاقِ چشم تمنا گنہ نہیں نرگس
خدا کرے کہ تجھے عصمتِ گناہ ملے

....

کون جانے کہ ہمیں راس بھی آئے گا سفر
ایک بار اور غزالانِ ختن سے مل لیں
آج پھولوں کو سنائیں کوئی افسانۂ دل
آؤ فرصت ہے کسی جانِ چمن سے مل لیں

....

یہ وہ اشعار ہیں جس میں پیرہن غزل کے خوشبو سموئی ہوئی ہے۔ نگارِ حسن اور شہر آرزو، غزالانِ ختن ایک مسحور کن کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ غزل میں علم وفن کی نمود سے، شعروادب کی رعنائیاں نکھرتی ہیں۔ غزل آئینِ محبت کی کڑی ہے جس کو نظر انداز کر کے غزل کے فن کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ لالہ زاروں کی حکایات، جادۂ شوق کو تیز گام کر دیتی ہیں اور یہیں سے غزل داستانِ دلبری اور داستان قاہری کے ساتھ فلسفیانہ افکار و نظریات کو اپنے دامن میں کھینچ لیتی ہے۔

اس جوش جنوں کو کیا کہتے یہ وحشت دل توبہ توبہ
اپنے ہی لرزتے ہاتھوں میں اپنا ہی گریباں ہوتا ہے
یہ بحث جنوں کی بحث نہیں یہ عقل و خرد کا کھیل نہیں
غم عقل کا ساحل ہوتا ہے، دل عشق کا طوفاں ہوتا ہے

....

اصل ہے ذوقِ طلب خام ہے سودائے جنوں
یہ تری جنسِ وفا آہ نہ کھوٹی نہ کھری

....

میں نے سمجھا تھا جنوں ہے غمِ ادراک کا حل
میرے آغاز کو دھوکا ہوا انجام کے ساتھ

....

جنوں میں دامنِ گلشن کی دھجیاں اُڑتیں
تو خارِ دشت کو ہم دعوت رفو دیتے

....

گلشن پہ رہی گریۂ شبنم کی اُداسی
بلبل کو کبھی باغ میں خنداں نہیں دیکھا

....

فضل امام کے غزل کے اشعار میں ایک جہانِ کیفیت مضمر ہے ان کی غزلوں میں رومانیت اور عصری حسیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ کہاں سے داخلیت اور خارجیت کی

حدیں ختم ہوتی ہیں۔ عالمی منظرنامے کو بھی بڑی فنی ریاضت اور فکری مناسبت سے نظم کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آج پہنچا ہے ہے وہاں قافلۂ دورِ حیات
تجھ سے اقرارِ وفا ظلم کا بانی مانگے

....

غور سے دیکھو تو مل جائیں گے اسرارِ حیات
ایک افسانہ ہے یہ گرتی ہوئی دیوار بھی
ہم نے سولی پر کیے روشن صداقت کے چراغ
کھیل ہے اپنے لیے یارو فرازِ دار بھی

....

جلاؤ شوق سے راون کو رام کے بھکتو!
وہ جل کے روشنی دیتا ہے، تیرگی تو نہیں
مرا سوال یہ ہے عہدِ نو کے راون سے
ترا وجود بہ عنوانِ آدمی تو نہیں

....

پروفیسر فضل امام وسیع المطالعہ ہیں۔ مشرقی ادبیات کے ساتھ اُنھوں نے مغربی ادبیات کو بھی پڑھا، دیکھا اور برتا ہے۔ اُن کی فکر میں وسعت اور مشاہدے کی تازگی ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے مسلم الثبوت بناتی ہے:

وجہِ تخلیق بشر، مقصدِ تکمیل حیات
آج تک حل نہ ہوا مسئلہ روح و نجات

عقل نے راہ دکھائی ہوئے ایمان خراب
تنگ ہے اہلِ جہاں شعبدۂ لات و منات
ہم نے ہر دور میں تاریخ جنوں دہرائی
گرچہ تھا ہوش کہ پرکار نہیں مقصد ذات

....

بغیر غزل کے مزاج سے آشنا ہوئے کوئی شاعر غزل نہیں کہہ سکتا۔ غزل کا مزاج آشنا ہونا آسان نہیں۔ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ لیکن پروفیسر فضل امام نے غزل کی روح کو بہت خوبصورتی سے پیمانۂ غزل میں ڈھالا ہے:۔

تری محفل ہے ساقی اور خالی جام آتا ہے
بدل دے نظم مے خانہ اگر الزام آتا ہے

....

تری تہذیب نے ہر سمت کھولے مے کدے کتنے
مگر ہر سمت سے مے خوار تشنہ کام آتا ہے

....

خرد اخلاق کے در کی بھکارن اس کو کیا سمجھے
وہ عالی مرتبت ہے دوستو دیوانہ پن میرا

....

لرزتی بجلیاں اک جوش طوفاں، موت کے ساماں
یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا آشیاں میرا

....

نشیمن جلتے جاتے ہیں عنادل اُڑتے جاتے ہیں
خدایا شعلہ زارِ بزمِ ہستی عام ہو جائے

غزل میں الفاظ کی درو بست اور اس کی حرمت لازمی ہے اس سے لفظ و معنی میں ارتباط پیدا ہوتا ہے اور ایک انبساطی کیفیت کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔

ہماری چاک دامانی کی قیمت تونے سمجھی ہے
یہی ٹکڑا گریباں کا رفو کے کام آتا ہے

....

کتنی موہوم تمناؤں کا تھا دل میں ہجوم
عشق خاموش ہے پھر کس سے بیاں ہوں یہ نکات

....

ادب کی اور بھی رعنائیاں نکھر آتیں
ہم علم و فن کو اگر شعر میں سمو دیتے

....

میں نے سمجھا تھا جنوں ہے غم ادراک کا حل
میرے آغاز کو دھوکا ہوا انجام کے ساتھ

....

زباں سے ہمسریِ گل تو خیر آساں ہے
غمِ چمن میں اُٹھائے تو کوئی داغِ جگر

....

میری سمجھ میں آنہ سکی وجہ برہمی
تونے تو اپنے غم کا فسانہ سنا دیا

....

فضل امام کی غزلوں میں سماج کا کرب بطور خاص نمایاں ہے وہ عصری آگہی اور شعور سے کام لیتے ہیں۔ گرد و پیش پر اُن کی گہری نظر ہے۔

دور تہذیب کا اے دوست یہ تلخابۂ ہوش
راہ میں لاشۂ بے گور و کفن سے مل لیں

....

نشیمن سے دُھواں اُٹھنے لگا ہے اے چمن والو
مجھے بھی اتنا بتلاؤ کوئی کب کام آتا ہے

....

مخالف ہے زمانہ مدعی چرخِ کہن میرا
رہے گا یادگارِ بزم ہستی بانکپن میرا

....

دولت اِن کا کھیل کھلونا، دولت کے متوالے ہیں
سکھ کی نیند کہاں ہے ساتھی محلوں میں درباروں میں

....

اہل خرد نے فن کو بخشی، عظمت کی تابندہ کرن
مے نوشی کا ظرف کہاں ہے آج ترے میخواروں میں

....

نہ پوچھو جب کہ اُٹھی ہے نقاب چہروں سے
رئیسِ شہر کے کتنے قصیدہ خواں نکلے

....

ادب کو جب سے سیاست بنایا لوگوں نے
غرض کی آگ میں روحِ ادب جھلستی ہے

....

بجھا دیئے ترے دستِ ستم نے فن کے چراغ
اور اب تو دور تلک ظلمتوں کی بستی ہے

....

جھیلے گا کون منزلِ ہستی کی سختیاں
تاریخ کہہ رہی ہے کہ انسان مر گیا

....

پروفیسر فضل امام کا طریق اظہار بڑا پُر تاثیر اور دل نشین ہے۔ اور اسی سے ان کی غزلوں میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جلال و جمال کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ منزلِ فن میں مستیِ کردار کے قائل ہیں۔ آخر میں اُنھیں کے اس شعر پر اپنے قلم کو روکنے کے لیے مجبور ہوں ؎

منزلِ فن میں نہ ہو جب مستیِ کردار بھی
تنگ ہے اہلِ جہاں پھر لذتِ گفتار بھی

ڈاکٹر عابدہ آفریدی
ریڈر، شعبۂ اُردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی، جے پور

❀❀❀

ڈاکٹر کوثر عالیہ
ایسوسیٹ پروفیسر
گورنمنٹ کالج، اجمیر

پروفیسر فضل امام بحیثیت قطعہ نگار

اُستاد محترم نے ہمیشہ اپنی شاعری کو ہم لوگوں سے پوشیدہ رکھا لیکن راجستھان کے بزرگ، محترم اور معتبر شاعر حضرت خوشتر مکرانوی نے ۱۹۸۱ء میں ایک کتاب مرتب کر کے شایع کی تھی وہ میرے سامنے ہے جس میں اُستاد کے قطعات بھی شامل ہیں۔ یہاں میں قطعہ کی عروضی، ہیئتی اور صنفی ہیئت سے بحث نہیں کروں گی۔ براہ راست اُن قطعات کے متعلق تاثرات پیش کرنے جا رہی ہوں۔ جن میں موصوف کی تخئیل اور فکری بصیرت سے فن کی رعنائیاں اپنی انفرادیت کی شناخت کراتی ہیں۔ دراصل قطعہ اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں جامعیت اور اختصار کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں گہری معنویت پیدا کر دینا اس کی بنیادی خصوصیت ہے اس میں اظہار خیال کی بڑی وسعتیں ہیں۔

قطعہ کی افادیت، غزل میں بھی نمایاں ہے۔ غزل گو شعراء اپنے خیال کو موثر طور پر نظم کرنے کے لئے غزلوں میں قطعہ بند اشعار کہتے رہے ہیں۔ پروفیسر فضل امام کے قطعات میں اُن کا گہرا شعور نظر آتا ہے ملاحظہ ہو۔

مرا شعور خرد آزما سہی لیکن
مری نگاہ میں یہ بزم کائنات تو ہے
تجھے حریف زمانہ کو مات دینی ہے
سحر کی بات نہ کر یہ حسین رات تو ہے

درج بالا میں خرد کی آگہی، حریفِ زمانہ کو للکارنا اور رات کے حسن کو سجایا گیا ہے۔ اُن کے قطعات میں جمالیاتی احساس بہت خوبصورتی سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

رات بھر جل کے کہا شمع نے کاشانے میں
سوز میرا سا نہ پیدا ہوا پروانے میں
فرق کیا ہے، یہ سمجھتے ہیں فقط اہل نظر
شمع کے جلنے میں پروانے کے جل جانے میں

درج بالا قطعہ میں جو غنائیت اور نغمگی ملتی ہے۔ اس میں تغزل کی کارفرمائیاں بہت دلکشی اور رومانی فضا کو استدلال عطا کرتی ہیں موسم گل کی لطافت، نگاہوں کا بانکپن ایک انتہائی نازک اور جذباتی کیفیت کا مظہر بن جاتا ہے۔

بانکپن کس کا نگاہوں کو سہارا دے گا
پھول کُملائے گا اک روز بکھر جائے گا
موسمِ گل کی لطافت کو نہ دے کیفِ جنوں
وقت کے ساتھ دبے پاؤں گزر جائے گا

شاعری میں مشاہدہ کی قدر و قیمت ہمیشہ دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ قطعہ نگاری کے فنی تقاضے ہر ہر قدم پر شاعر کے ذوقِ تخلیق کا امتحان لیتے ہیں، درج ذیل قطعات شاعر کے گہرے شعور کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں فکر و فن کا اتصال نمایاں ہے۔

کس نوع کے انسان ہیں اِس بزم میں یارو!
ادراک کے قائل بھی ہیں ، پابند جنوں بھی
یہ عالمِ ہستی بھی ہے اِک فتنۂ محشر
نظارۂ جاں سوز ہے اندازِ فسوں بھی

☆☆☆

مے کی ہی طلب ہے نہ ہے کچھ جام کی پروا
خم خانۂ عالم کی سحر دیکھ رہا ہوں
سمجھے نہیں اِدراک طلسماتِ جہاں کو
ہر لمحہ اسے زیر و زبر دیکھ رہا ہوں

☆☆☆

لالہ زاروں کی حکایات میں اک کیف تو تھا
جادۂ شوق تک آئے تو گلستاں نہ ملا
رہ گزاروں سے گزرتے رہے راہی لیکن
نقشِ انساں تو ملا دہر میں انساں نہ ملا

☆☆☆

کانٹوں میں بسر ہو کہ شگوفوں میں گزر ہو
دو روز کی دُنیا ہے کسی طرح سے جی لے
حالات کا رُخ دیکھ، مشیت پہ نظر کر
پینا جو پڑے زہر تو ہنس کھیل کے پی لے

☆☆☆

درج بالا قطعات میں جو آرٹ ہے وہ شاعر کی فطری مناسبت اور ذہانت کی

غمازی کرتے ہیں۔ شاعر نے اپنے افکار پریشاں کو ترتیب و تزئین سے دل چسپ بنا دیا ہے جس میں اس کے افکار و نظریات دعوت غور و فکر عطا کرتے ہیں۔

پروفیسر فضل امام نے زندگی کے ساز اور آواز کو ایک تہہ دار راز سے آشنا کرایا ہے۔ چند قطعات پیش کرتی ہوں ؎

تاج اک خواب کی تعبیر ہے یہ بھی سچ ہے
تاج ممتاز کی خوابیدہ سی انگڑائی ہے
چاندنی رات نے اک نقش بنا ڈالا ہے
پیکرِ سنگ میں فردوس اُتر آئی ہے

☆☆☆

ہائے وہ عہدِ بہاراں کی سہانی گھڑیاں
مسکرائے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے
وہ بھی اک رات تھی جب روٹھ گیا تھا کوئی
رات آتی ہے تو اب رات سے جی ڈرتا ہے

☆☆☆

جانے والوں کو کہیں روک سکا ہے کوئی
پھول برساؤگے کیا آگ لگاکر جاؤ
مجھ سے مانگے نہ کہیں میری تمنا تجھ کو
اپنے دامن سے چراغوں کو بجھا کر جاؤ

☆☆☆

زندگی تلخ ہوئی جاتی ہے اے وائے حیات
پیار ہے دشمنِ جاں، زہرِ ہلاہل ہو کر
دیکھیے عشق کی بیگانہ روی کیا ہے کہ ہم
اُن کی زلفوں سے چھٹے پا بہ سلاسل ہو کر

☆☆☆

کب ہم نے کسی دوست کا شکوہ کیا لوگو!
احباب سے تلخی کی شکایت نہیں کرتے
ہر زخم پہ ہر چوٹ پہ ہنس دیتے ہیں لیکن
دُنیا کی روایات سے نفرت نہیں کرتے

☆☆☆

صنفِ قطعہ اپنے اختصار کے باوصف مضامین کے تنوع کی سج دھج رکھتی ہے۔ اس میں تہذیبی اور تمدنی انجذاب کے ساتھ عصری آگہی اور عصری حسیت کے تقاضے بھی نظم ہوتے رہے ہیں۔ پروفیسر فضل امام کے درج بالا قطعات ان گوناں گوں کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں تلخیٔ حیات کی لذت آفرینی، پیار کی کسک، عشق کی بیگانہ روی، زلف گرہ گیر کی رومان پرور فضا بھی ہے حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرے بھی۔ روایات دُنیا پر طنز و تشنیع کے نشتر بھی لیکن نیش زنی پر خندن زن بنے رہنے کا عزم مصمم بھی۔ ان قطعات میں فکری بصیرت اور ذہنی اُفق کی وسعتیں دعوت غور وفکر عطا کرتی ہیں۔

❀❀❀

شیخ شبانہ انجم
ریسرچ اسکالر

امعانِ نظر پر ایک نظر

پروفیسر سید فضل امام کی علمی وادبی خدمات کم وبیش چھ دہائیوں پر محیط ہیں جدید اردو تنقید میں پروفیسر فضل مام صاحب اپنے مخصوص تنقیدی افکار ونظریات کے باعث انفرادیت کے حامل ہیں اور ایک طویل مدّت سے اپنی بیش بہا تنقیدی کاوشوں کے زیر اثر ادبی منظرنامے پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو ان کی علمی وادبی دانشمندانہ صفات کے مظہر ہیں۔ ان مجموعوں میں امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری، جدید ہندی شاعری، سمت و رفتار، افکار ونظریات، انیس شناسی، انیس شخصیت اور فن، شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی، مشرقی انتقادیات، عثمان عارف: ایک مطالعہ، تنقیدی معیار، علامہ اقبال کی اساس فکر، امعانِ نظر وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

امعانِ نظر اپنے صوری ومعنوی اعتبار سے اہم ہے۔ اس مجموعے میں ۱۹ مضامین شامل ہیں جو کہ مختلف نوعیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے متعلق ''حرفے چند'' میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''......یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ جن میں شعری اور ادبی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ نئے ذہنوں

کو مشرقی تنقید کے ابعاد سے روشناس کرانے میں مفید ہوں گے۔''

مشرقی تنقید کے ابعاد سے روشناس کرانے کی سعی ان کے پہلے ہی مضمون سے شروع ہو جاتی ہے۔ ''اکبرالہ آبادی اور مشرقی اقدارحیات'' میں پروفیسر فضل امام نے اکبرالہ آبادی کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کرنے کے ساتھ ان کی محنت اور لگن کی پوری روداد بیان کردی ہے جو کہ اکبرالہ آبادی کے فکروفن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ساتھ ہی اکبر پر اٹھائے گئے ان اعتراضات پر بھی بلیغ اشارے کرتے گئے ہیں جس کے سبب اکبر تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے اور جج کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے ہوئے بھی رجعت پسند اور کند ذہن کہلائے۔ جبکہ ان کا کلام خود ان اعتراضات کا بہترین جواب فراہم کرتا ہے بس ذرا عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے ان کی متعدد اشعار بھی رقم کئے ہیں ۔

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

لہٰذا اکبر کے فکری ابعاد کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ کسی طرح سے بھی مغربی تعلیم اور نئی تہذیب کے پوری طور سے مخالف نہیں تھے بلکہ اس تہذیب کے تمام مثبت پہلوؤں کے متعلق اچھے خیالات رکھتے تھے لیکن اس کی اندھی تقلید کے سخت مخالف تھے۔ اس مخالفت کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے۔ جس کو طنز و مزاح کی چاشنی سے مہمیز کر مزید پراثر بنانے کی نمایاں کوشش کی گئی ہے۔

دراصل اکبرالہ آبادی مشرقی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے اور وہ

زوال پذیر قوم وملت کے حالات سے بے چین تھے۔ ان حالات کو بہتر بنانے کا ذمہ اٹھایا اور خوب اٹھایا۔ مضمون کے آخر میں فضل امام صاحب اپنی قیمتی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اکبر مشرق کے تہذیبی وتمدنی افکار کے نقیب تھے اور ہر چیز کو مغرب سے وابستہ کرنے کو غلط سمجھتے تھے بلکہ مشرق کا بھی انسانی زندگی کو پُر وقار بنانے میں گراں قدر حصہ ہے۔ اکبر مشرق کے دلدادہ تھے لیکن مشرق کی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے بلکہ ایک غیر جانب دار مبصر کی طرح سے بھر پور تبصرہ کرتے تھے۔ یہی بے لوث انداز ان کی شاعری کی روح بھی ہے اور کامیابی کی دلیل بھی''

اس کتاب میں شامل دوسرا اہم مضمون ''مطالعۂ میر کی قدر و قیمت'' ہے۔ اظہر من شمس میر تقی میر کی اہمیت وآفاقیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ کلام میر ہر زمانہ ہر دور میں لائق تحسین اور عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا کلام آج بھی اردو شعر وادب میں آفتاب و ماہتاب کی مانند روشن ہے اگر چہ کلام میر کی تفہیم کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ تحقیق وتنقید کے اس امر میں ان کی معنویت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی شہرت یافتہ تصنیف ''شعر شور انگیز'' جو کہ میر کے سلسلے کی اہم کڑی ہے اس میں کئی ایک مقامات پر شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات سے اختلافات رکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک شمس الرحمٰن فاروقی میر کے اہم اشعار پر مذہبی غلبہ کے اثرات کا حوالہ دیتے ہوئے سرسری طور سے گزر گئے۔ اس چشم پوشی کی طرف موصوف نے اشارہ کیا ہے۔ اس ذیل میں لکھتے ہیں۔

"صاحب شعر شور انگیز" کا یہ لکھنا کہ میؔر پر شاعری کے بجائے مذہبیت غالب تھی، دراصل یہ میؔر کے ساتھ ناانصافی ہے اور اس کے معتقدات کے ساتھ مضحکہ خیز رویہ ہے، اور معتقدات کو تعصبات کے خانہ میں رکھنا ناانصافی اور حق تلفی ہے۔"

"امعانِ نظر" میں شامل ایک اور اہم مضمون "اختر شیرانی کی شاعری میں ترقی پسندانہ عناصر" ہے جو کہ اپنے عنوان سے ہی اپنی اہمیت کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری اور شخصیت پر شاعر رومان وشاعر شباب کا لیبل کچھ اس انداز سے چسپاں ہے کہ بیشتر ناقدین نے انہیں اس عینک سے دیکھا اور سمجھا ہے لیکن اس کے برعکس پروفیسر فضل امام نے اختر شیرانی کی شاعری میں ترقی پسند افکار و خیالات کا بخوبی جائزہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی جوش کی نظم "کسان" سے ان کی دو نظموں جو کہ خصوصاً کسان کے موضوع پر لکھی گئی ہیں ان کا موازنہ کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جوؔش کا کسان مایوس اور حرماں نصیب ہے جبکہ اختر شیرانی کا کسان پُرامید اور باحوصلہ ہے۔

اختر شیرانی کی شاعری رومان کی شاعری ہونے کے ساتھ عصری مسائل سے بھی دوچار ہے اور شاید ہی کسی کو اس حقیقت سے اعتراض ہو کہ کوئی بھی حساس فنکار عصری حالات سے آنکھیں نہیں چرا سکتا اور وہ ان تمام مسائل کو خواہ وہ سیاسی، سماجی ومعاشی نوعیت کے ہوں اپنی تخلیقات میں شعوری یالاشعوری طور سے پیش کرتا ہے۔ ادب اور سماج کے اس رشتے کو ترقی پسند تحریک میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ادب زندگی میں پیداشدہ داخلی وخارجی حالات کے اظہار کا بہترین آلہ ہے۔ لہٰذا اختر شیرانی کی نظمیں اسی حقیقت سے مملو نظر آتی ہیں۔ فضل امام صاحب نے اپنے

ناقدانہ افکار کے انسلاک سے اختر کی نظموں کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ جس میں اختر شیرانی کی ترقی پسندانہ فکر روشن ہے۔ اختر کی اس نوعیت کی دیگر نظموں میں ''طوفان کی آمد، مزدور کی زندگی، غربت کی پیدائش، فاقہ، کسان، بنگال، انقلاب وغیرہ ہیں۔ جس میں اختر کی نگاہ دوررس ہندوستان کے ماضی میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی ہے۔''

بقول پروفیسر سید فضل امام رضوی ؎

''دراصل اختر شیرانی کا عہد ہندوستان کی قومی زندگی کا بڑا انتشار پرور عہد تھا۔ سیاسی انقلابات اور اس کی تحریکات ہندوستانی سماج کو زیر وزبر کیے ہوئے تھیں پہلی جنگ عظیم، تحریک خلافت، عدم تعاون اور دوسری جنگ عظیم کے بھیانک اثرات ایسے تھے جن سے اختر شیرانی کی شاعری متاثر نظر آتی ہے اور ایک حساس فن کار کا حق ادا کر کے اپنے نگارخانۂ شاعری میں فنی چابکدستی سے سجائے ہیں۔ جس سے ان کے خلوص کا احترام واجب ہو جاتا ہے۔''

اگرچہ اس مجموعے میں شامل تمام مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن محب وطن مجاہد آزادی محمد علی جوہرؔ پر لکھا اُن کا مضمون ''جوہرِ قابل محمد علی جوہرؔ'' ان کی وطن دوستی و وطن پروری کی جانب واضح اشارہ ہے۔ پروفیسر فضل امام نے مذکورہ مضمون میں محمد علی جوہر کو نہ صرف یاد کیا ہے بلکہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا پرزور اعتراف بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو فراموش کرتے جا رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جبکہ آنے والی نسلیں شاید ان کے نام سے بھی واقفیت نہ رکھیں۔ اس افسوس کے ساتھ ایک خوش آئند اعلان بھی کیا ہے کہ اب جوہر شناسی کا آغاز ہو رہا ہے۔

"اُمید ہے کہ جوہر کے سیاسی افکار کے ساتھ ساتھ ان کے صحافتی، شعری وادبی افکار ونظریات کے وسیع پیمانے پر مطالعہ اور تجزیہ کیا جاسکے۔"

پروفیسر فضل امام کی 'امعانِ نظر' نہ صرف شاعر اور شاعری تک محدود رہی بلکہ وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے نثری ادب کے اہم گوشوں، نقطوں پر بھی اپنے تنقیدی قلم کے جوہر دکھائے ہیں جن میں زبان و بیان کے تقاضے بھی ہیں اور ذکر حافظ بھی، سجاد ظہیر کا لسانی ادراک اور پریم چند کی حقیقت نگاری کی پرتیں بھی کھولی ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے اہم اور طویل مضمون "اردو میں جدید مرثیہ نگاری ایک اجمالی جائزہ" ہے جس کی اہمیت اس بات سے لگائی جاسکتی ہے کہ فضل امام صاحب نے اس موضوع پر اپنی پوری ایک کتاب لکھ ڈالی ہے جو کہ ان کی تنقیدی وتخلیقی صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس میں جدید مرثیہ نگاروں کے کارناموں کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کے ساتھ موجودہ عہد میں ان کی اہمیت ومعنویت کا مختصراً جائزہ لیا ہے اور اس کے نیک مستقبل کی جانب واضح اشارے بھی کئے ہیں۔

مرثیہ جو کہ رونے، رُلانے بین کرنے تک ہی محدود تھا مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے زار وقطار رونے پر اکتفا کرنا تھا اب یعنی کہ جدید مرثیہ قدیم مرثیے سے ایک قدم آگے کی چیز ہے۔ اب اس کی معنویت میں عصری تقاضوں ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وسعت پیدا ہوگئی ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام رقم طراز ہیں:۔

"دراصل مرثیہ صرف رونے رُلانے کے لئے نہیں بلکہ یہ باب درس وہدایت بھی وا کرتا ہے۔ کردار کی تعمیر وتشکیل میں اہم رول

ادا کرتا ہے جدید مرثیہ میں اس پہلو پر بطورِ خاص زور دیا گیا ہے۔''

گوکہ پروفیسر صاحب تنقیدی رویوں میں ترقی پسندانہ عناصر سے اس حد تک اتفاق رکھتے ہیں جہاں زندگی کو سنوارنے سجانے بہتر سے بہتر کا عمل جاری و ساری ہے۔ وہ نہ جمود کے قائل ہیں اور نہ ہی اُس کوری مغربی تنقید کی تقلید کے جس میں پھنس کر شعروادب کی تفہیم معمہ یا چیستاں کے مرحلے طے کرنے لگتی ہے۔ ان کے تنقیدی افکارونظریات مشرق کے صحت مندانہ عناصر سے مزین ہیں۔ جس میں مغربی تنقید کی کارفرمائیاں اس حد تک شامل ہیں جہاں پر نقادِ مشرق کی اہمیت کو مزید واضح کرنے کی کوشش میں مغربی تنقید سے موازنہ کرتا ہے۔ گویا کوری اندھی تقلید کو وہ منھ سے اُگلے نوالے سے تعبیر کرتے ہیں جس کی اہمیت صفر ہے۔ بدلتے ہوئے تنقیدی رویوں سے وہ شاکی بھی ہیں اور مایوس بھی ساتھ ہی کوشاں ہیں اس کی بہتری کے لئے۔

مجموعی طور پر ''امعانِ نظر'' ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس کی پذیرائی علمی وادبی حلقوں میں کی جائے گی۔

پروفیسر فضل امام کی
چند منتخب نثری نظمیں

پروفیسر فضل امام کی نثری نظموں کا انتخاب شامل ہے۔ دراصل اردو میں نثری نظمیں مغربی شعریات کی ترجمان ہیں۔ لیکن اگر غیر جانب دار ہو کر ماضی کے آئینہ خانوں میں دیکھا جائے تو عربی، فارسی، سنسکرت اور قدیم اُردو میں بھی اس انداز کی نثر کا وجود ملتا ہے۔

پروفیسر فضل امام کی نثری نظموں میں حیات انسانی کے حقائق اور فن کی رعنائیوں کا حسین ترین امتزاج ملتا ہے۔ دراصل وہ زندگی کو ایک مخصوص شریفانہ سطح و معیار سے دیکھتے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے مسائل کو اختصار جامعیت سے سمو لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی نثری نظموں کا مطالعہ ہمیں اُن کے فنی ارتقا کی نشاندہی کراتا ہے۔ ان مختصر مگر معنی خیز نظموں میں مقصدیت اور انسان دوستی کا گہرا تفلسف مضمر ہے۔ آج کے اس پُر آشوب اور دَور ظلمات میں جب کہ انسان کی زندگی اُس سسکتی، بلکتی اور سہمی ہوئی سیتا کے مانند ہے جو لرزتے ہوئے شعلوں میں کھڑی ہے۔ پروفیسر فضل امام کی یہ نثری نظمیں روح کو بالیدگی اور فکر کو توانائی عطا کرتی ہیں۔

یقین ہے کہ نثری نظموں کا یہ انتخاب بھی افکار و نظریات کی نئی جہتوں کی نشاندہی کرنے میں کامیاب ہوگا۔

ترتیب و انتخاب
ڈاکٹر خورشید فاطمہ
جے پور (راجستھان)

روح کا روح سے رشتہ

دھان کے دانوں کی لالچ دے کر
میں نے اس کبوتر کو وہاں سے اُڑانا چاہا
جو اپنے انڈوں کو
ممتا سے سینک رہی تھی
لیکن اس کی پلکوں کی
اس ایک جھپک نے ہی مجھے شکست دے دی
جس نے کہ مجھ کو سمجھایا
کہ یوں جسم کی تسکین کے لئے
کہیں اپنی روح کو دور
اور غیر محفوظ نہیں چھوڑا جا سکتا
جسم سے جسم کا رشتہ
تو آخر کب تک نبھتا ہے
ٹوٹ ہی جاتا
لیکن روح کا روح سے رشتہ
لاکھ کوشش کرنے پر بھی
کبھی نہیں ٹوٹتا، کبھی نہیں ٹوٹتا۔

شمع حیات

کبھی گیتوں سے ہی اُلفت تھی
وہ میری کائنات تھی
لیکن
آج دھرتی کی ہر گونج میں میری آواز ہے
جس کو کہیں بھی سنا جا سکتا ہے
اور میرے وجود کا یہ انداز ہے
جو کسی بھی نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے
کسی بھی مطمع نظر سے سمجھا جا سکتا ہے
پھر مجھے کوئی گمراہ کر سکے؟
یہ کیسے ممکن ہے
بس مری شمع حیات کی لو کو
مستقل جلنے دو
اور ظلمات کو انوار سے معمور کرنے دو

اُداس کبوتر

جھروکھے میں بیٹھا اُداس کبوتر
بھیگی پلکوں سے
کبھی باہر جھانکتا ہے، کبھی اندر جھانکتا ہے
وہ دیکھ رہا ہے
بھیتر کی دنیا ویران کر دی گئی ہے
اب یہ قصر کھنڈر ہے
اور
باہر کی دنیا
بس بس کر کے بھی ویران ہو رہی ہے
کیونکہ
اس کی بنیاد کھوکھلی ہے
اور کہیں بے جان ہیں
قدیم حویلی ڈھہ رہی ہے
نئے فلیٹ تعمیر ہو رہے ہیں
اس لئے ان دنوں جبلی ستونوں کے درمیان

لٹکتے ہوئے تاروں پر ہی زندگی گزارنے کو
وہ کبھی اِدھر حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے
کبھی اُدھر
وہ سوچ رہا ہے
آدمیت وہ شے ہے
جو اجڑے ہوئے کو بسانا جانتی ہے
اور جو راستہ بھول کر بھٹک گئے ہیں
انہیں سیدھی پگڈنڈی پر لگانا
اپنا فرض سمجھتی ہے
لیکن آج جو آدمی ہے
وہ آدمیت میں یقین نہیں رکھتا
خود تو اجڑا ہوا ہے ہی
دوسروں کو بستا ہوا بھی نہیں دیکھنا چاہتا
دھرتی کھسکتی جا رہی ہے
آکاش بھاگا جا رہا ہے
وہ بیچارہ سہارے کی تلاش میں
کبھی اِدھر، کبھی اُدھر
کبھی نیچے، کبھی اُوپر
بڑی حسرت بھری نگاہ سے
دیکھتا ہے، جھانکتا ہے، تاکتا ہے

شاید وہ آکاش کی دنیا کو چھوڑ
پچھتا رہا ہے
اور اس آدم کی مہیب شکلیں دیکھ کر
اپنے زخمی جسم کو ڈھیل دے کر ستا رہا ہے
لیکن، وہ اُڑ نہیں سکتا
کیونکہ یہ عالم آدم ہے
یہاں وہ پر توڑ دیے جاتے ہیں
جو حسرت پرواز رکھتے ہیں
وہ آنکھیں پھوڑ دی جاتی ہیں
جو تاریکیوں کے حصار کو توڑ کر
روشنی تلاش کر لیتی ہیں
اس لئے وہ بے بس، بے کس
کبھی آنکھیں بند کر
کبھی کھول کر، جھانکتا ہے
کنکھیوں سے دیکھتا ہے
سہم سہم کر تا کتا ہے

❀❀❀

طائر حیات

زندگی کی منحوس آوازیں
موت سے بھی زیادہ خوف ناک ہوتی ہیں
موت کا تقاضہ ہے،
کہ اُس کا پیغام سن کر،
یہ طائر حیات
بغیر مضطرب ہوئے، خود ہی رخصت ہو جائے
اور زندگی کا تقاضہ ہے
کہ اس کا ہر ارمان، اس آدم کی
زندہ لاش کو سلگا سلگا کر کے جلا جائے
دھوؤں کے بادلوں میں لگتی ہوئی آگ
لپکتے ہوئے سرخ سرخ انگاروں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے
کھنڈر کا پتھر گا رہا ہے
کہ دن بھر کی محنت و مزدوری کر کے
تھکا ہوا جسم یہاں راحت سے سو رہا ہے
اور محلوں سے کوئی آواز آرہی ہے

کہ رات دن عیش وعشرت سے اوبا ہوا
کوئی جسم سسک سسک کر یہاں رو رہا ہے
شاید سسکتی ہوئی اسیری اور عیش کی آہیں
غریبی کی غیر شادی شدہ چاہت سے زیادہ
.........خوفناک اور عبرت ناک ہوتی ہیں
لیکن
یہ آدمی بھی بڑا عجیب وغریب ہے
جو بے مقصد یوں جیئے جا رہا ہے
اور زہر سے لبریز سمندر کو لبوں سے لگائے
سقراط اور شنکر بننے کی فراق میں اسے پئے جا رہا ہے
اور
اسے نہیں معلوم
کہ تنکوں کی آڑ میں چھپی ہوئی چھپکلی
گلے میں لپٹے سانپ سے زیادہ خوف ناک ہوتی ہے۔

مینڈک اور آدمی

ہم نے لیبارٹری میں
خوب تجزیہ کر کے دیکھا
خوردبین کی مدد سے دیکھا
تو یہی حاصل تجزیہ و تجربہ ٹھہرا
کہ مینڈک اور آدمی میں کوئی بھی فرق نہیں
ساخت میں، تعمیر و تشکیل میں، انداز فکر میں
زندہ رہنے کی تمناؤں میں
سوائے اس کے کہ
مینڈک تفریح طبع کے لئے آدمی پر پتھر نہیں پھینکتا
آدمی پر کنکر نہیں مارتا۔

وجود آدم

میں ہر بار اپنے وجود کا منکر ہوتا ہوں
لوگ سمجھتے ہیں،
میں قید ہوتا جا رہا ہوں،
مجھے محسوس ہوتا ہے،
میں آزاد ہوتا جا رہا ہوں۔

زندگی اور تحیر

نہیں معلوم، آج تک کیسے زندہ رہا
کیوں زندہ رہا
جیسے بھی زندہ رہا، جس طرح سے بھی رہا
بس یہ کہ زندہ رہا
لیکن تاسف نہیں
حیرت واستعجاب نہیں
اس لئے کہ
بھیڑوں اور بکریوں کے درمیان زندہ رہا
مگر، طمانیت قلب ہے
کہ ان کی طرح نہیں زندہ رہا

دستک

جب بھی کوئی دستک ہوتی ہے،
دروازے
ایک دہشت سی بیٹھ جاتی ہے
دل میں
کون ہوسکتا ہے باہر؟
وہ تو نہیں
جو ہے میرے اندر؟

فریب نظر

تمہاری تصویر نے
ضرور فریب دیا مجھے
لیکن
صرف ایک بار
تم تو
جتنی بار ملتے ہو
فریب ہی دیتے ہو

ہنستے ہوئے گلاب

ہنستے ہوئے گلاب کو
جھولتے ہوئے دیکھا جب ڈال پر
پیار سے
ٹانک لیا اور اسے شیروانی میں
تھوڑی ہی دیر بعد
توڑ مروڑ کر
پھینک دیا اسے کوڑے کے ڈھیر میں
کیا ایسے ہی کوڑا نہیں بنا دیتے ہیں ہم
اکثر و بیشتر
محبت کا؟
یوں ہی توڑ مروڑ کر؟

چیختی ہوئی بھیڑ

بند آنکھوں میں
پیر آتی ہے چیختی ہوئی بھیڑ
اپنے اپنے سوالوں کا جواب طلب کرتے ہوئے
سوچتا ہوں
کتنی بے وقوف ہے یہ بھیڑ
کوئی بھی سوال
کیا کبھی انتظار کرتا ہے کبھی
کسی بھی جواب کا؟

تنہائی

بھیڑ میں اچھی لگتی ہے تنہائی
جب اکیلے ہوتے ہیں
لگتی ہے بھیڑ اچھی۔

رنگِ انقلاب

چوراہے تک آتے آتے
تھک کر ٹھہر جاتے ہیں سبھی راستے
سینے پر خنجر رکھ کر کہا جاتا ہے ہمیں
ان میں سے کوئی ایک
دل پسند راستہ پھر سے منتخب کرنے کے لئے
جب کہ اچھی طرح سے جانتے ہیں ہم
اس انتخاب کی زبان کے دام میں آ کر
اندھی گھپاؤں سے لے کر خلاء کے راستوں تک
آپس میں تقسیم ہوتے رہے ہیں
کسی ایک کو منتخب کرتے رہے ہیں
اور قید سے سے جدا ہوتے رہے ہیں
انتخاب ہوتا ہی اس لئے ہے کہ سب سے کٹ کر رہ جاؤ
یہ ہمیں کب معلوم تھا
اور کب علم تھا کہ

روشنی کے نام پر
تاریکیوں کے یوں ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں گے
ٹکڑے کر دئے جائیں گے نظر آنے والے فاصلے
آنکھ اور پردوں کے درمیاں میں
اب نگاہیں ضرور ہیں ہمارے پاس
لیکن اس میں ٹھہری ہوئی روشنی
بطور رہن رکھی ہوئی ہے دوسروں کی تحویل میں
جس کے حصول کی ناکام کوشش میں
رکھتے جا رہے ہیں ہم
اپنے وجود کا لمحہ لمحہ رہن
ایک مکمل اور بھرپور آسمان گرا دیا ہے ہماری دھرتی پر
ہمیں بہلایا جا رہا ہے، طفل تسلی دے کر
کہ کوئی فرق نہیں ہے
روئی میں اور خونِ آدم میں
اب ہمیں واضح طور پر احساس ہونے لگا ہے
روشنی کی اس سازش میں
کتنی سہولت بخش ہوتی ہے تاریکی کی زندگی
یہ بھی پوشیدہ نہیں رہ گیا ہے اب

کہ ہماری فطرت
پان میں رکھے اس تمبا کو خوردنی سے زیادہ نہیں
جس کو زبان پر رکھتے ہی تھوک دیا جاتا ہے
ہمسایوں کی دیواروں کو رنگنے کے لئے
انقلاب کا رنگ
سرخ منتخب کرلیا گیا ہے۔

جہاد اور نسل

جہاد،
سمت و رفتار کا ہوتا ہے
کبھی سیڑھیوں کا نہیں
جہاد،
نظر کا ہوتا ہے
کبھی نسلوں کا نہیں
رفتار بدل جائے
جہتیں متغیر ہو جائیں
سیڑھیاں بدلنے کی ضرورت نہیں
نظر بدل جائے
نسلیں بدلنے کی ضرورت نہیں

صداقت؟

صداقت کے قتل کے لئے
لازمی نہیں ہے
بندوق یا تلوار
صرف اور صرف اتنا ہی کافی ہے
زور سے نعرہ لگا دیں
صداقت زندہ باد
صداقت زندہ باد۔

کارزارِ حیات

خداوند بزرگ و برتر کی درگاہ میں
دعائیں کرتا رہا عمر بھر
لیکن کوئی بھی دعا نہیں کرسکا
اپنی ذات کو علاحدہ کر کے
کارزارحیات میں
جم کر مقابلہ کیا جم غفیر کا
لیکن خود اپنا سامنا نہیں کرسکا
کبھی
احتساب نفس کے طور پر تنہائی میں

وفاداری

روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں کتے اس شہر میں
بھیڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے
صرف اُنھیں کتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے زندہ رہنے کے لئے
جو بن گئے ہیں پالتو، ان بھیڑیوں کے
باندھ لیا ہے جنہوں نے پٹا گلے میں وفاداری کا
اپنے آقا کے لئے
جو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں
بھونکنے کے لئے
کاٹ کھانے کے لئے
ان کے علاوہ سب کتوں کو آوارہ قرار دے دیا گیا ہے
چھوڑ دیا گیا ہے اُنہیں
شہر کے دوسرے حصے میں

زہر کی روٹیاں کھا کر
تڑپ تڑپ کر مر جانے کے لئے
یہ شہر جیسے جیسے مہذب ہوتا جا رہا ہے
کم ہوتے جا رہے ہیں روز بروز کتے
صرف اور صرف
بھیڑیوں کی تعداد میں
حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوتا جا رہا ہے

سنہرا ماضی

کھو کھلے بانس میں
ایک سُریلی پھونک بھر دو
وہی گیت بن جائے گی
کھوکھلی مٹی میں
ایک جذبات سے بھرپور سانس بھر دو
وہی چراغ بن جائے گی
کھو کھلے خوابوں میں
ایک طرح کا احساس بخش دو
وہی ساعد یمیں بن جائے گا
اور تخلیق کے اسی کھو کھلے پن میں
زندگی کے شیریں نغمے کو مستقل برسنے دو
حقیقت میں وہی شیریں حال مستقبل کی نسل کے لئے
سنہرا ماضی بن جائے گا۔

جسم کی آگ

جسم کی آگ
پھر بھی آگ
جس میں جسم نہیں
روح سلگتی ہے۔

قصاص

ظلم اور جور............اور
زیادتیوں کی قائم مقام
کبھی بھی زیادتیاں نہیں ہوسکتیں
پھر زیادتیوں کی فریاد کرنے والے
کیوں زیادتیوں کو ایمان بنائے ہوئے ہیں
نہیں نہیں،
ایسا نہیں،
یہ زیادتیاں نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر
انتقام یا قصاص کی آگ ہے
جو بھڑک رہی ہے
تو کیا
جذبۂ انتقام جادۂ اعتدال پر گامزن رہ سکے گا؟؟

ننھی سے دھوپ

ننھی سی دھوپ
رنگ برنگی
کھیتوں، کھلیانوں، جھیلوں، دریاؤں،
جھونپڑوں، چمنوں اور ایوانوں پر
اپنی زردروئی کی دلکشی کے ساتھ رقص کناں ہے۔

عدلِ الٰہی

لفظ بیچارہ
بے کس و مجبور
بڑا معصوم ہوتا ہے
کیونکہ
اس پر ظالم اور مظلوم
دونوں برابر کا حق جتاتے رہتے ہیں
اور
جب ظالم و مظلوم
جابر و مجبور
دونوں رحمت الٰہی کے مستحق ہیں
تو پھر
عدلِ الٰہی کا کیا ہوگا ؟

اکتوبر کی چاندنی

چودھویں رات
خوابوں کی نیلی وادی میں
متبسم اندھے چاند نے
دھرتی کو اپنی آغوش میں لینا چاہا
لیکن وہ اپنا اندھا پن نہ دور کر سکا
تب ہی
ایک دن سننے میں آیا کہ
شب دیجور کی تاریکی
اس کے تبسم کو نگل گئی
جب بیت گئی برسات
خوابوں کی نیلی جھاڑیوں کے درمیان
بیقرار اور مضطرب پیاسا دریا
زندگی بھر دیتا رہا ٹھنڈا پانی تھکے ماندے بیقرار طائروں کو

لیکن وہ اپنی تشنگی نہ دور کر سکا
پھر اکتوبر کی چاندنی رات میں میں نے دیکھا
کہ اندھا چاند
دریا کے سفید، صاف اور شفاف پانی میں جھانک رہا ہے
اور دریا اس چاندنی کے اجالے میں
اپنی تشنگی کی تھاہ لگا رہا ہے۔

پروفیسر فضل امام کے چند منتخب مضامین

﴿۱﴾

اتحاد بین المسلمین - وقت کی اہم ضرورت

آج کے اس دور پرآشوب اور عہد ظلمات میں جب کہ اسلام کے خلاف زبردست بین الاقوامی سازش رچی جارہی ہے اور مغربی ذرائع ابلاغ اسلامی دہشت گردی کا عنوان دے چکا ہے۔ مسلم ممالک کی تعداد زیادہ ہونے کے بعد بھی کمزور و ناتواں ہیں اور آپس میں دست و گریباں ہیں۔ خود مسلمان مسلکی اختلافات میں ناگفتہ بہ صورت حال تک اُلجھا ہوا ہے۔ ہر فرقہ ایک دوسرے کو جہنم کا پروانہ دے رہا ہے۔ خود کو نوری اور دوسرے فرقے کو ناری قرار دینے میں فخر ومباہات محسوس کررہا ہے ایسی نازک صورت حال میں مسلکی اختلافات سے بلند و برتر ہو کر اتحاد و اتفاق از بس کہ لازمی ہوجاتا ہے۔ واضح حکم ربانی ہے کہ:-

"واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔"

(ترجمہ: "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپ میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔")

یہ وہ پیغام الٰہی ہے جو تمام مسلکی اختلافات کی بیخ کنی کے لئے کافی ہے لیکن افسوس ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو کافر ثابت کرنے میں ہی پوری توجہ وقوت صرف کرنے میں لگا ہے۔ حالانکہ اس سے کسی فرقے کو کوئی دینی و دنیوی فائدہ نہیں ہے۔

اسلام ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب اور تمدن بھی ہے۔ اگر کوئی آدمی

غیر مہذب ہے اور تفرقہ پردازی پروان چڑھ رہی ہے اس سے شرم سے سر جھک جاتا ہے۔ وحشیانہ عمل بربریت اور سفاکیت کبھی بھی مہذب و متمدن عمل نہیں کہی جا سکتی ہے۔ اسلام کبھی بھی خون و غارت گری کی اجازت نہیں دیتا ہے بلکہ انسان کو مہذب و متمدن بناتا ہے وحشی نہیں۔

افسوس کہ اس دور جہل پرور میں وحشیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کسے وحشی قرار دیں گے۔ جبکہ یہ دور سائنس و ٹیکنالوجی اپنے بام عروج پر پہنچ چکا ہے لیکن یاد رکھئے کہ وحشی انسانوں کا عہد ختم نہیں ہو گیا ہے اور شاید مستقبل میں بھی مہذب انسانوں کے ساتھ وحشی بھی اسی طرح رہیں گے جیسے کہ آج کل رہ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کا بنیادی فریضہ ہے کہ جو لوگ ہمارے عہد کے وحشی ہیں انہیں پہچانیں اور اپنے گراں قدر تہذیبی سرمائے کو اس سے محفوظ رکھیں۔ مہذب اور وحشی یعنی جنگلی آدمی میں تفریق کیا ہے؟ کیا وحشی جنگلوں میں گھومتا ہے؟ میلے کچیلے کپڑے پہنتا ہے؟ سڑک پر آوارہ پھرتا ہے؟ سڑی گلی چیزیں کھاتا ہے؟ جہاں چاہتا ہے ضروریات بشری سے فراغت حاصل کر لیتا ہے؟ گفتگو کا سلیقہ نہیں آتا؟ اگر یہی سب تفریق ہوتی تو بآسانی وحشی اور مہذب آدمی کا فرق نمایاں ہو جاتا۔ لیکن دراصل انہیں بنیادوں پر امتیاز نہیں قائم کیا جا سکتا۔ زرق برق لباس، لچھے دار باتیں، مقطع بنے رہنا ہی مہذب آدمی کی شناخت نہیں ہے۔ انہیں چیزوں کا نام تہذیب و تمدن نہیں ہے۔ کوئی شخص وحشی ہونے پر بھی صاف ستھرے لباس پہن سکتا ہے۔ انداز گفتگو بھی بڑا دلچسپ ہو سکتا ہے۔ بقول جگر مرادآبادی۔

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
لہجے میں کہیں تاثیر نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اس طرح کا آدمی انسانیت و آدمیت کا دشمن ہونے پر بھی مہذب انسانوں کے درمیان پہچانا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ "مہذب وحشی" کے ذیل میں آجاتا ہے۔" اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مہذب آدمیوں کے اخلاق و اعمال و افعال پسندیدہ ہوتے ہیں اور وحشی آدمیوں کے ناپسندیدہ تو یہ معیار کئی لحاظ سے درست نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر سری لنکا کی جنگلی وڈا قوم صدق مقالی میں لاثانی ہے۔ جزیرۂ انڈمان کے وحشی قبیلوں میں جھوٹ بولنا بڑا گناہ گردانا جاتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی وحشی قومیں اور قبیلے ہیں جو ایفائے عہد مہمان نوازی اور عورتوں کے تحفظ میں لاجواب شہرت رکھتے ہیں۔

دراصل کسی مہذب و متمدن قوم میں جو نمایاں صفت پائی جاتی ہے اور کسی وحشی قوم و قبیلے میں نہیں۔ وہ ہر موقع اور ہر بات میں عقل برتنے کی کوشش ہے۔ وحشی آدمی کے اکثر کام جوش جذبے وہم یا خوف کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یا گذشتہ لوگوں کی روایتوں اور سنی سنائی باتوں کی نقل در نقل..... لیکن..... مہذب آدمی کے لئے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ بات قرین عقل ہے؟ اور اگر یہ بات بعید از عقل ہے تو کون سی بات عقل کے مطابق ہوگی؟ وحشی آدمی اگر اس طرح عقل کی کسوٹی پر باتوں کو پرکھنے لگے اور یہ کہنے لگے کہ یہ بات یا رسم عقل کے خلاف ہے تو اسے قبیلے کے لوگ ہی فوراً مار دیں گے یا اگر محفوظ رہا تو وحشی نہیں رہ جائے گا..... مہذب قوموں میں ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے کہا جاتا رہا ہے۔ ایک اور صفت ہے جو مہذب قوم میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ مہذب آدمی کو یہ قوت تمیز حاصل ہوتی ہے کہ اچھی چیزیں اس وجہ سے کم یا زیادہ قیمت کی نہیں ہوتیں کہ ہمیں کسی خاص وقت میں ان کی کتنی ضرورت ہے۔ مگر وحشی قوم صرف اپنی ضرورت کو دیکھتی ہے۔ درحقیقت اچھی یا بری چیزوں کی جانچ پرکھ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم کسی خاص حالت کا خیال کر کے ان کی قیمت لگائیں۔ مثال

کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ اگر مہذب اور وحشی آدمی دونوں کو شدت سے بھوک لگی ہو تو مہذب آدمی بھوکا ہونے پر بھی نہیں سمجھے گا کہ روٹی کے سوا دنیا کی کسی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن وحشی کے لئے روٹی کے ایک ٹکڑے کے سامنے بڑی سے بڑی چیز کی اہمیت اور تقدس کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ۔ قرآن کریم میں واضح ارشاد ہے ''افلایعقلون، افلایتفکرون ''یعنی قرآن کا مطالعہ عقل سے کرو تفکر سے کرو۔''

دراصل مہذب قوم اور سماج وہ ہوتا ہے جس میں اول عقل کو ہر قسم کے سوال کرنے اور جواب دینے میں روک ٹوک نہ ہو۔ دوسرے اچھی اور بری چیزوں میں تمیز کرنے کی قوت ہو۔ اتحاد بین المسلمین کے لئے عقل اور قوت تمیزی بہر حال ضروری ہے۔ اگر یہ دو چیزیں پیدا ہو جائیں تو پھر مسلکی اختلافات از خود ختم ہو جائیں گے۔

ادھر کچھ دنوں سے پسماندہ مسلمان اور غیر پسماندہ مسلمانوں کی تفریق بھی سیاسی مصلحتوں کے باعث بڑی شد و مد کے ساتھ پیدا کی جا رہی ہے اور اب تو یہ ایک تحریک کی شکل قائم کر چکی ہے۔ یہ بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اب تو پورا مسلم سماج ہی پسماندہ ہے۔ اس لئے ایسے نازک موڑ پر یہ تفریق پیدا کرنا ملت کے شیزازے کو منتشر کرنا ہوگا۔ ہم نے بھی علیحدہ علیحدہ برادریوں کی انجمنیں بنا ڈالی ہیں فرقوں اور مسالک کے اختلافات تو اپنی جگہ ہیں فرقوں میں بھی پیشے کے اعتبار سے برادریاں اور ان کی انجمنیں سرگرم عمل ہیں۔ جس سے مسلم سماج کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ افسوس تو اس پر بھی ہے کہ آپسی رشتے بھی قائم نہیں ہوتے۔ بڑے سے بڑا واعظ، مبلغ دین، مفتی اور مصلح بھی تقریر تو اتحاد کی کرتا ہے مگر عمل میں خود پابند رسوم و رواج ہے۔ کسی سید سے پٹھان کے یہاں رشتے کے لئے کہئے تو ابروؤں پر بل پڑ جائیں گے۔ کسی انصاری سے، کسی سلمانی یا منصوری کے لئے رشتے کی پیش کش کیجئے تو

چیں بہ جبیں ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ اسلام میں ذاتوں کی تفریق نہیں ہے یہ سب کے سب پیشے ہو سکتے ہیں۔ پیشے میں عیب نہیں ہے۔ دراصل جب تک اس طرح کا سماجی اتحاد قائم نہیں ہوگا۔ مسلم سماج بکھرا بکھرا رہے گا۔ حالانکہ اسلام میں شرافت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ ذات، برادری نہیں۔ ''اِنَّ اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔'' (تم میں بزرگ اور مکرم وہی ہے جو صاحب تقویٰ ہے)۔

ارشاد خالق کائنات ہے:۔''انما المومنون اخوۃٌ'' (تمام برادر ایمانی آپس میں بھائی ہیں)۔ اسلام نے اخوت کا درس دیا ہے۔

دراصل مسلمانوں کا ہر فرد دوسرے افراد کی زندگی کا ذمہ دار ہے اور ایک مسلمان کا استطاعت رکھتے ہوئے دوسرے مسلمان کا فاقہ کرنا ناممکن ہے۔ حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہو جائیں اس قانون کو بہرحال نافذ کرنا پڑے گا۔ حکومت شرعیہ رہے یا نہ رہے خود افراد اس قانون پر عمل کریں گے۔

حدیث رسول کائنات میں اعلان ہو رہا ہے:۔

''جس مومن نے بھی دوسرے مومن کو استطاعت و امکان رکھتے ہوئے کوئی ضرورت کی چیز دینے سے انکار کر دیا اسے پروردگار روز قیامت اس طرح اٹھائے گا کہ چہرہ سیاہ، آنکھیں نیلی اور ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ اور کہا جائے گا کہ اس خائن نے اللہ و رسول کے ساتھ خیانت کی ہے لہٰذا اسے جہنم میں جھونک دیا جائے۔''

درحقیقت اسلام پورے عالم بشریت و آدمیت کو ایک نقطۂ مرکزیت عطا کرتا ہے۔ انسانی فکر و ذہن کو اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اذہان کی تشکیل و تربیت کرتا ہے۔ جس میں حیات و کائنات، سیاست و اجتماع اقتصاد و اخلاق

سارے کے سارے مسائل سمٹ کر کارگہِ حیات میں بروئے کار آجاتے ہیں۔

اسلام وحدت میں یقین رکھتا ہے۔ اس وحدت کا تصور اتحاد و اتفاق میں ہے۔قوم مسلم کے نفع ونقصان یکساں ہیں۔لہذا مسلک وفرقے کی کشیدگی پورے مسلم سماج کے لئے سبب ہلاکت بنتی جارہی ہے۔ اگر اسلام کو مرکز وحدت مان کر زندگی کا لائحہ عمل طے کیا جائے تو مسلکی اختلافات کہیں بھی حائل وحارج نہیں ہوسکتے ہیں۔ ائمہ اربع میں امام مالک، اما ابوحنیفہ، امام شافعی، امام حنبل فقہی اختلافات کے باوجود ایک نظریۂ وحدت رکھتے ہیں تو دیگر فقہ میں بھی یہی اتحاد و اتفاق برتنے سے مسلم سماج کا شیرازہ منتشر ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔

خوشی ہے کہ محترم جٹس شمس السلام جعفری صاحب نے کریلی الہ آباد میں اسلامک اکیڈمی کی بنیاد رکھ کر اسی جذبۂ اتحاد و اتفاق کوفروغ دینے کی سعی بلیغ کی ہے اور فرقہ وارانہ نیز مسلکی ہم آہنگی کوتقویت بخشنے کے لئے اس کا دستور العمل جس نہج پر رکھا گیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔قوی امید ہے کہ اسلامک اکیڈمی جو پیغام پیش کررہی ہے وہ برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہوگا۔

بقول علامہ اقبالؔ:-

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

علامہ اقبالؔ نے اپنے جس دل کے اضطراب کا اظہار درج بالا بند میں کیا ہے افسوس کہ اب وہ اختلاف مسلم سماج کا مقدر بن چکا ہے۔ لیکن اگر اتحاد و اتفاق رواداری اور اسلامی نظریۂ حیات وطرز زندگی کونہیں اپنایا گیا۔ اور جنون و بربریت، سفا کیت و بہمیت کا چلن یوں ہی رہا تو ہمارا شمار وحشی قوم میں ہوگا۔ اور ہم دنیا میں ظالم دہشت گرد کہلائے جائیں گے۔ اور ہمارا وجود دین اسلام کے لئے باعث ننگ و نام ہوگا۔

اس مختصر مضمون میں تفصیلات اور مزید مثالوں کو پیش کرنے کی گنجائش نہیں صرف اشاروں پر اکتفا کی گئی ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ مسلم اس کرۂ ارض پر اپنے وجود کا ثبوت دیتے ہوئے وقت کی رفتار پر نظر جمائے ہوئے ہر طرح کے معاشرتی اقتصادی اور مسلکی اختلافات کو ختم کر کے اتحاد و اتفاق باہمی کو برقرار رکھتے ہوئے اسلام کے امن، صلح و آشتی کے پیغام آفاقی کو تمام خطۂ ارض میں پھیلائیں۔

وآخرالدعوانا انِ الحمد للہ رب العالمین۔

❀❀❀

﴿۲﴾

کلام اقبآل میں تصور نساء

علامہ اقبال ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جن کہ نگاہ بصیرت حیات انسانی کی مختلف جہتوں پر گہرے تفکر وتفلسف سے کام لیتی ہے۔ وہ نبّاض فطرت ہیں۔ صنف نسواں کو انھوں نے کئی پہلوؤں سے سمجھا، پرکھا اور برتا ہے۔ جہت انسانیت کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنے کا موثر ترین ذریعہ عورت اوراس کا طرز حیات ہی ہے۔ مرد کو کسی طرح عورت پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ دونوں اصناف کے خصوصیات اور جواہر جدا جدا ہیں۔ عورت کے صفات اس کی عفت، عصمت، ہنرمندی اور شعور ہے تو مرد کا جوہر دلیری، بہادری، علم اور کمال ہے۔ عورت مصحف تخلیق بھی ہے اور تزئین حیات بھی۔ یہ شاعری کی لطافت اور احساس کی نزاکت ہے۔ اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگِ درا'' میں ایک مختصر نظم ''ماں کا خواب'' بچوں کے لیے جہاں سبق آموز ہے اور بہت سی صورتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہیں ''سلیمیٰ'' ایک دوسرے رخ کی ترجمان ہے۔ اس نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:-

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ، تیری کمال اس کا

اقبآل نے عورت کے جلال وکمال، شجاعت اور بہادری کا منظر بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک غریب لڑکی جو طرابلس کی

جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ یہ نظم ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی ہے:-
ملاحظہ ہو۔

چند اشعار:-

فاطمہ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

ماں کا وجود اولاد کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آغوش مادر میں ہی بچے کا شعور بیدار اور بالیدہ ہوتا ہے۔ ماں کی لوریاں بچے کو سکونِ قلب عطا کرتی ہیں۔ اقبال نے نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" سچے اور دلی تاثرات کا اظہار بڑی وارفتگی سے کیا ہے۔ عورت جب ماں بنتی ہے تو کس طرح اپنی آغوشِ تربیت سے علم وحکمت کے موتی پروتی ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رُخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اُس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے
علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت ، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

ماں کی ممتا اور اس کا پیار کس درجہ دل میں کشش رکھتا ہے اور ماں کس طرح بیٹے کا انتظار اور اس کی خیریت کی طلبگار رہتی ہے اسے اقبال نے بڑے والہانہ انداز میں نظم کیا ہے ۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دُعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

یہ نظم عہد طفلی میں ماں کی تربیت اور پرورش کا نقشہ پیش کرتی ہے اور ماں کی قدر و قیمت کا بھرپور احساس دلاتی ہے اور ماں کا سایہ چھن جانے کے بعد رنج واندوہ کا شدید احساس بھی دلاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عورت کی قدر و اہمیت اور اولاد کی نشو ونما میں ماں کا جذبۂ ایثار بھی پیش کرتی ہے۔

علامہ اقبالؔ کے تیسرے مجموعۂ کلام ''ضربِ کلیم'' میں ''عورت'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں بڑے فکر انگیز اشارے ہیں جو اذہان کو بیدار کرتے ہیں اور مردہ اذہان پر ضرب کاری بھی لگاتے ہیں۔ ''مردِ فرنگ'' مگر سلجھنے کے بجائے فرنگی معاشرت نے اسے مزید پیچیدہ بنادیا اور وہ عورت جو غیرت و شرافت کا پیکر اور مہ و پروین جیسے جمال کی مالک ہے اس کی معرفت مردِ سادہ حاصل نہیں کرسکا۔ ملاحظہ ہو

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا ، وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مُرد سادہ ہے بیچارہ، زن شناس نہیں

مغرب کی معاشرت اور وہاں کے فلسفی عورت کی حمیت، غیرت اور اس کی اہمیت معاشرے کی تشکیل کے لیے نہ کل سمجھ پائے تھے اور نہ آج تک سمجھ پائے ہیں۔ طہارتِ نفس اور تطہیر مزاج عورت کی حرمت اور تقدیس کی تفہیم کے بغیر کبھی بھی کسی پاکیزہ معاشرے کی تشکیل و تعمیر ممکن نہیں۔

علامہ اقبالؔ ایک بہت چبھتا ہوا سوال یوروپ کے فلسفیوں سے کرتے ہیں۔

''کہ تمہارے حلقہ بگوشوں میں ہند اور یونان کے لوگ تو ضرور ہیں .....لیکن ذرا یہ تو بتلاؤ کہ کیا معاشرت (Society) کے لیے یہی کمال ہے کہ مردوں کا وجود بیکار محض ہو اور عورتیں تہی آغوش ہو کر رہ جائیں'' نظم ..... ایک سوال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش!
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟
مرد بیکار و زن تہی آغوش!

دراصل یہ مغربی تمدن پر بھرپور طمانچہ ہے، جو سوال کے شکل میں علامہ اقبال نے کیا ہے۔

''پردہ'' اقبال کی نظم ہے جو صرف تین اشعار پر مشتمل ہے لیکن اس کا اختصار گہری معنویت اور جامعیت لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں:-

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے
خدا یا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں ، میں نے
وہ خلوت نشیں ہے ! یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

اقبالؔ، عورت کی حرمت اور عفت کو بنیادی طور پر اہم قرار دیتے ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر اسلامی ہے۔ وہ ماں کی مامتا، الفت اور شفقت کو انتہائی والہانہ انداز میں نظم کرتے ہیں اور ماں کی رہبری اور رہنمائی کو شمع راہ کہتے ہیں عورتوں کی نمائش اور جلوہ

آرائی کی ہوس کو سبب رُسوائی و ذلت ٹھہراتے ہیں۔ وہ عورت کی آرائش کو آنکھوں کا تماشائی کہتے ہیں لیکن اس سے آئینۂ دل مکدر ہو جاتا ہے۔ وہ ذوق نظر کو حدوں میں رکھنے کے قائل ہیں اور جب یہ ذوق نظارہ حدوں کو پار کر جاتا ہے تو کردار و افکار پراگندگی اور ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اقبال کے پیش نظر حقوق نسواں اور اس کی بحالی کے پہلو ہمیشہ رہے ہیں اور اپنے کلام میں بڑے مدلل اور مستحکم انداز سے حقوق نسواں کی افادیت کو مختلف انداز سے حکیمانہ دانش وری سے نظم بھی کرتے رہے ہیں اُن کا یہ بھی فرمانا ہے کہ عورت کی تعلیم و تربیت اور اُن کے ناموس کا تحفظ مردوں کا بنیادی فریضہ ہے، اُن کا مطمح نظر درج ذیل اشعار سے بالکل واضح ہو جاتا ہے ۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اُسی درج کا درِ مکنوں !
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اقبال کا تصورِ نساء تقدیس و تحریم کا حامل ہے لہٰذا اس کی نسوانیت کو ہر طوفان سے بہر حال محفوظ رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ آزادی نسواں کے مخالف نہیں بلکہ علمبردار ہیں لیکن آزادی کی حدوں میں یقین رکھتے ہیں تا کہ آزادی میں توازن اور اعتدلال قائم رہے۔ وہ فرزندانِ تہذیب حاضر اور اس کے پرستاروں کو متنبہ کرتے ہیں اور آزادی نسواں کے راز ہائے سربستہ کو عورت کی بصیرت و بصارت پر محمول کرتے

ہوئے بڑے موثر انداز میں اپنی نظم ''آزادیٔ نسواں'' میں فکر انگیز طور پر گویا ہیں۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے یہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں ، معذور ہیں ، مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلو بند

اقبالؔ انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن تہذیب فرنگی کو موت قرار دیتے ہیں عورتوں کو قدیم وجدید تعلیم سے آراستہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک باعلم ماں سات نسلوں کو زیور تعلیم سے مزین کرتی ہے۔ وہ عورت ہی ہے جس کے پاکیزہ وجود سے قوم بنتی اور اگر عورت، تعلیم یافتہ ، باسلیقہ اور باشعور نہیں ہوگی تو قومیں خود ہی تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ چنانچہ اقبالؔ اپنی نظم ''عورت اور تعلیم'' میں فرماتے ہیں:-

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے ''نازن''
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر، مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

عورت کو تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف عورت ہی رہنا چاہیے وہ ''زن'' ہی رہے ''نازن'' نہ ہوجائے اگر عورت اپنی نسوانی اقدار کو بھلا دیتی ہے تو وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود قابل قدر نہیں بلکہ ایسی تعلیم کا نتیجہ خودکشی کے مترادف کہلائے گا۔ عورت کو دین اور دینی تعلیم سے بھی باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ مدرسۂ دین سے بیگانگی اُسے پایۂ اعتبار نہیں بخش سکتی۔ اس لیے کہ دین حق ہی عورت کے حقوق کو بحال رکھنے کا حکم دیتا ہے اور دین سے اخلاقی اقدار حیات بارآور ہوتی ہیں۔ حفظ مراتب، شائستگی اور شعور کی بالیدگی دین حق سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اسی لیے مفکر اسلام اقبالؔ، مدرسۂ زن کو دین سے آراستہ کرنے کے لیے متوجہ کرتے ہے۔ تاکہ انسانی معاشرہ (Human Society) عظمت آدم کو سمجھے اور خود انسان باعث وجہ تخلیق کے راز سے آشنا ہو اور یہ کام ایک دیندار ماں ہی بحسن وخوبی انجام دے سکتی ہے۔ مکتب کی کرامت ہی آدابِ فرزندی سے آگاہ کرسکتی ہے اور اسی کے فیضانِ تربیت سے طاغوتی طاقتیں غلبہ نہیں حاصل کر پاتیں اور ایک مثبت فکر ونظر کا سماج عالم وجود میں آتا ہے۔ وہ عورت کو خاتونِ خانہ دیکھنا چاہتے ہیں، شمع محفل نہیں۔ اقبالؔ نے مغربی معاشرہ کو بذات خود دیکھا تھا جہاں ہر پیکر رعنائی اسٹیج پر رقص کناں تھی۔

اقبالؔ کا مشاہدۂ مغرب عمیق تھا اور یورپ، جرمنی وغیرہ کا سفر خوب کیا تھا۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض ہوئی تھی......لیکن اُن کی چشم حق بیں میں مدینہ منورہ اور نجف اشرف یعنی شہرِ علم اور بابِ علم کی خاک کا سرمہ تھا اس لیے جلوۂ دانش فرنگ سے اُن کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوسکیں۔ جیسا کہ خود معترف ہیں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یا

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزی ادراک

اقبالؔ عالم نسواں کو بھی اسی خاکِ مدینہ و نجف سے فیض یاب ہونے کے تلقین کرتے ہیں تا کہ انسانی معاشرہ پاکیزہ ہو اور انسانی اخلاقی اقدار (Human Moral Values) پائمال اور مجروح ہونے سے بچ جائیں۔ انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں مدراس کی خواتین سے فرمایا تھا۔

''آپ نے اپنے لیے ایڈریس (سپاس نامہ) میں ''اسیرانِ قفس'' کے لئے جو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان سے مجھے مغربی عورتوں کی اس تحریک کا خیال ہوا جیسے ترکی میں یا اور جگہ یورپ میں (EMACCIPATION) یعنی ''مردوں کے غلبے سے آزادی'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ کو لفظ ''آزادی'' پر نہیں جانا چاہیے بلکہ آزادی کے صحیح مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔ یورپ کی آزادی ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ یورپین تہذیب باہر ہی سے دیکھی جارہی ہے۔ کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ بڑھے ہوئے معیار زندگی کا وہاں کے لوگوں پر یہ اثر پڑا ہے کہ بعض ماں، باپ بچے کی زندگی کا بیمہ (INSURANCE) کرادیتے ہیں۔ پھر بچے کو تھوڑی خوراک دے کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کو اسی قسم کی ہلاکت سے بچانے کے لیے یوروپ میں کئی (N.G.O.S) رفاہی سوسائٹیاں مقرر ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن پڑھیں اور اس کی تعلیم پر غور کریں۔''

اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؔ، ''آزادیٔ نسواں'' کے قطعی مخالف نہیں تھے مگر وہ اس آزادی کو قرآنِ کریم اور سنتِ پیغمبر اسلام کی روشنی میں ہونا پسند کرتے تھے۔ مغربیت اور مغربی یلغار اور اس کی کورانہ تقلید میں نہیں ہو۔ اقبالؔ اپنی شہرۂ آفاق اور گراں قدر الہامی تخلیق ''رموزِ بے خودی'' میں در معنی ایں کہ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا، اسوۂ کاملہ حیات برائے نساء عالم میں فرماتے ہیں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول
مادراں ، را اُسوۂ کامل بتول

نوری و ہم آتشی فرما برش
گم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او زبالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامانِ نماز

اُشک اُو بر چید جبریلؑ از زمیں
ہم چو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

ترجمہ:

حضرت بتولؑ (زہراؑ) تسلیم و رضا کی کا حامل تھیں، لہذا آپؑ ہر انسان کے لیے کامل نمونۂ عمل ہیں۔

جن و ملائک جن کے تابع فرمان تھے اُن کی رضا اپنے شوہر کی رضا میں گم تھی۔

صبر و رضا کی تربیت یافتہ سیدۃ النساء جن کی زبانِ مبارک پر قرآن کی آیات تھیں اور

ہاتھ چکی پیسنے میں مصروف ہوتے۔

آرام وسکون سے بے نیاز، راتوں کو بارگاہِ الٰہی میں اپنے آنسوؤں کے موتی مصلّۂ عبادت پر بکھیرتیں۔

وہ جن کے آنسو، رشکِ گوہر ہیں اُن کا یہ مرتبہ کہ جبرئیل امین نے اُنھیں لے جا کر عرش پر شبنم کی طرح بکھیر دیا۔

علامہ اقبال نے دخترِ رسولِ کائنات حضرت فاطمۃ الزہرا کو اسوۂ کاملہ نظم فرمایا ہے اور اُن کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہیں۔ اقبالؔ، عورت کی عظمت، حُرمت اور عفت کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتے ہیں اور آزادیٔ نسواں کا مطلب اپنی شخصیت کی پاکیزہ تکمیل اور تشکیل ہے۔ عورت شوہر کی اطاعت گزار ہو اور اُس کی مرضی میں اپنی مرضی گم کردے، اور مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ عورت کی تحریم وتقدیس کی حفاظت کے لیے ہر لمحہ آمادہ رہے کہ عورت کا وجود آتشیں لذتِ تخلیق سے تو ضرور آشنا ہے مگر اسی وجودِ آتشیں سے اسرارِ حیات کھلتے جاتے ہیں۔

سماج میں انسان نُما بھیڑیئے ہی بھیڑیئے نظر آتے ہیں لہٰذا مرد کو عورتوں کی ناموس وحرمت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جانا چاہیے اور عورتوں کو بھی زن وشو کے تعلقات کو بہتر وخوش نما بنانے کے لیے سیرتِ معصومۂ کونین پر عمل پیرا ہونا چاہیے تاکہ پاکیزہ تعلیم وترتیب سے جہنم زدہ معاشرہ کو بہشت زار بنایا جاسکے۔ (آمین)

﴿۳﴾

اقبالؔ کا مردِ مومن

اقبالؔ کے ''مردِ مومن'' کا تصور بہت واضح ہے مگر اربابِ علم و دانش اسے کافی بحث طلب بنائے ہوئے ہیں۔ بہت سے ذہنی تحفظات اور تاریخی موشگافیوں کے باعث تاویلات و تدلیسات کا بازار گرم رکھا جاتا رہا ہے۔ کبھی شاہیںؔ کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہیں اس کی پرواز کو نمونہ بنایا گیا لیکن بات اس طرح سے نہیں بنتی ہے حالانکہ اس طرح کے بہت سے اشعار کلام اقبالؔ سے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یا

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

درج بالا قسم کے اشعار سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ اقبالؔ کی تلاش و جستجو انسانوں کی رہبری کے لئے ایک پرندہ کو ہی پیش کر سکی ہے۔ تعجب ہے کہ اقبالؔ کو کوئی انسانی پیکر نہیں نظر آیا۔ کیا تاریخ آدمیت اور انسانیت کسی شاہیںؔ کو جنم دے سکی؟ دراصل اقبالؔ کے لاشعور میں شاہیںؔ کے صفات مرتسم ہیں جس کا اعلان اس کی روح ارتقائی طور پر کر رہی ہے اور جس پر شعریت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اقبالؔ ایک ایسے انسانی پیکر کی تلاش میں ہے جو ضروری نہیں کہ صاحب حکم ہو اور سریر و سپاہ اور تاج و نگیں کا مالک ہو...... بلکہ جو صرف قوی پنجہ ہو، تنہا اپنی ذات میں کامل۔ جو بھی ذاتی صفات کے میدان میں اس کا حریف ہو، وہ اسے کبوتر کی طرح دبوچ کر شکست دے سکے۔ وہ ہمہ تن سرگرم عمل اور سرگرم پرواز ہو۔ آشیانے یا ساز و سامان کی حرص و آز سے بے نیاز ہو۔ وہ قصر سلطانی یا سیاست کے مراکز سے وابستہ نہیں ہو۔ اس کے صفات اور اصول پرستی چٹانوں کی طرح اس کی رفیق ہوں۔ اب اقبالؔ کے شاہیںؔ کو اس کی بلند ترین شکل میں پیش کیجئے اور پھر اس اعلیٰ وارفع صفاتی شاہیںؔ کا تطابق تاریخ عالم کے صفحات سے کیجئے تو تاریخ ایک منفرد پیکر انسانی کو مثال کے طور پر پیش کرنے میں فخر محسوس کرے گی اور اقبالؔ کو عالم انسانیت کو پیغام دینے کے لئے اسی مثالی انسان کی تلاش ہے۔ اقبالؔ کی نگاہِ تجسس مختلف انداز سے مختلف مقامات پر جاتی ہے۔ کبھی اُسے یونانیوں کا علم الاصنام صرف ایک تخیل نظر آتا ہے۔ مصریوں کی تاریخ ادھوری، بے ربط اور یاوہ گوئی معلوم ہوتی ہے۔ رومؔ کے پاس محض جبر و استبداد اور عیاری دکھائی دیتی ہے اور ایک ایسا شاہین نظر آتا ہے جو کمین گاہوں میں بیٹھا ہوا ہے اور ہر بے گناہ بچے اور جوان کبوتر کو جھپٹ کر اپنا شکار بنالیتا ہے۔ وہ کبوتر کی جان بخشی میں یقین ہی نہیں رکھتا ہے۔ اقبالؔ قدیم نبیوںؑ کے احاطے کی سیر کرتا ہے۔ وہاں اُسے جزوی اور منتشر صفات ملتے ہیں۔ دینِ یحیٰؑ و عیسیٰؑ فقط غار و کوہ اور بزرگی میں راہبی۔ حضرت اسماعیلؑ، آداب فرزندی کی مثال۔ حضرت یوسفؑ اور حضرت اسحاقؑ کی نامکمل داستانیں ہیں۔ حضرت موسیٰؑ عمران کے عصا کا شکوہ اور ہیبت، ید بیضا روشنی کے لئے اہم ہے۔ اقبالؔ کارِ کلیمیؑ کو ساز و سامان کی گدائی قرار دیتے ہیں:

ے　　بغیر عصا کے کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

یا۔　　ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے

یا۔　　خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبال کی معرفت شناس نظر عصا سے ضربِ کلیمی نہیں پیدا کراتی بلکہ خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اقبال کلیم اللہ کے معترف ہیں اوران کی ہیبت و طاقت سے متاثر ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے زورِ عصا سے کام لیتے ہیں اوران کی زبان لکنت زدہ ہے۔ حضرت موسیٰ کی تقلید وہی کرسکتا ہے جو پہلے ربّ ہارون و موسیٰ سے ویسا ہی عصا حاصل کر سکے۔ مگر ہر کس و ناکس یہ عصا نہیں پا سکتا۔ اقبال ایک ایسے باطنی جوہر کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جس کے ہاتھ میں جو بھی عصا آجائے اس میں عصائے کلیمی کے صفات آشکار ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات حضرت موسیٰ اوران کے عصا سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبال کردار و عمل کے اعتبار سے ایک مکمل انسان کی تلاش میں ہیں۔ اس کی نگاہیں ایک دانائے سبل و ختم المرسلین، سرور کائنات پر جا کر ٹھہرتی ہے جو فیضانِ نظر سے خاکِ راہ کو اسرار الوندی عطا کر رہا ہے۔ اقبال اس بارگاہ میں پگھل جاتا ہے لیکن مقامِ نبوت و رسالت اور مقام بشریت کے درمیان حجاب کون اٹھائے؟ طالب و مطلوب حاجب و محجوب کے رازہائے سربستہ کون کھولے؟ حضرت محمد مصطفیٰ کے سانچے میں کون ڈھل سکے؟ بعد ختم الانبیاء کس طرح خدا سے نبوت مانگی جائے؟ نبوت کو عام انسانی ماحول میں کیسے پیش کیا جائے تا کہ عام انسان اس کی تقلید کر سکے۔

اقبال اسے شدت سے محسوس کرتا ہے کہ یہاں پر نبی نہیں بلکہ جادۂ نبیؐ پر گامزن ہونے والے ایک غیر ملکی کی لیکن انسانِ کامل کی ضرورت ہے۔ نبی کی ذات

مانند آفتاب ہے۔ اسے براہ راست دیکھنا اور پرکھنا مناسب نہیں۔ ایک ایسے آئینے کی ضرورت ہے جو کمالات نبوت کو ''ملکات نفس'' کے طور پر جذب کرے، جس میں صحیح طور پر دیکھا اور پرکھا جا سکے۔ یاد رہے کہ نبیؐ کے کمالات عطائے خداوندی ہیں لیکن اس کے صحیح اور سچے مقلد یا متبع کے کمالات ذاتی ہیں اور اس ذات کو جوہر اور کمال عطا کرنا فیضانِ نگاہِ نبوتؐ ہے۔ یہ کامل متبع ہی مومن بن سکتا ہے۔ تقلید و اتباعِ کامل، یقین کامل کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا مومنین کے جزوی اور انفرادی اوصاف اس مکمل مومن میں کلّی طور پر ہونے چاہئیں۔ اسے جملہ اوصاف حمیدہ کا جامع ہونا شرط ہے۔ اگر کمال نبوتؐ نے ایک بھی اس طرح کا نمونہ پیش نہیں کیا تو نبوتؐ کے کمال پر حرف آتا ہے کہ وہ خود جزوی صفات کی حامل تھی، اکمل نہ تھی۔ اس لئے اقبالؔ کمال نبوتؐ کے مقلد تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

نہ میں عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوتؐ کا مقام

اور عارف کے مقام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

جب مقام عارف کی تفہیم ہی دُشوار ہے تو معرفتِ مقام نبوت تو اور بھی دشوار گزار ہے۔ اس منزل پر اقبالؔ کا تجسس اور بھی بڑھ جاتا ہے اور اس مومن کی تلاش میں سرگردانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کی واحد صفت ''ایمان بالیقین'' ہے۔ جس

میں شک وشبہ کا گزر نہیں۔ جس چیز یا بات کو ایک مرتبہ دیکھ، پرکھ یا سمجھ لیتا ہے اس پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ یقین، مومن کی اعلیٰ صفت ہے۔ اقبالؔ اسی صفت کو اس طرح شعری پیکر میں پیش کرتا ہے ۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اَے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

یا

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الا میں پیدا

اسی یقین کی مختلف شکلوں کو اقبالؔ مختلف رنگ روپ میں پیش کرتا ہے لیکن یہ پیش کش شاعر کی کشفی کیفیات واردات کی ترجمانی ہے جس میں بے ربطی پائی جاتی ہے۔ اقبالؔ اسے کبھی ''جذبِ دروں'' سے موسوم کرتا ہے اور کبھی اسے ''شرر'' کا نام دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اقبالؔ اس صفت کے موسوم کا عرفان حاصل کر لیتا ہے ۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یا

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یا

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہے آفاق

یا

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

یا

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اقبال کا مردِ مومن اس قدر جانباز ہے کہ بغیر تیغ بھی لڑتا ہے۔ اسے کسی عصا کی ضرورت نہیں۔ شبِ ہجرت، دشمنوں کے محاصرہ میں تلواروں کے سائے میں سوتا ہے مگر کوئی تلوار باندھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہے۔ وہ رحم وکرم اور عفو سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن جب معرکۂ حق و باطل سرگرم ہوتا ہے تو عرصۂ لافتیٰ کا شہسوار ہوتا ہے۔ فوجوں کے ہجوم میں صفدر ہوتا ہے۔ وہ بندھے ہوئے قیدیوں کو دیکھ کر کبھی سر قلم کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ میدانِ کارزار میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتا ہے۔ وہ کرّار ہوتا ہے۔ حدیثِ رسولِ کائنات ہے "لا عطین الرایتہ غداً رجلاً کراراً غیر فرارٍ یحب اللّٰہ ورُسلہ یفتح اللّٰہ علی یدیہ"

وہ مجمعِ عام میں سلونی قبل انتفقدو نی کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ عاجز جواب نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ میں زمین کی راہوں کی بہ نسبت آسمان کی راہوں سے زیادہ واقف ہوں۔ اقبال کا مردِ مومن کلیم باتسخیر نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ کلیم بے عصا بھی ہے۔ اس کی تسخیر صرف مملکتوں کی تسخیر نہیں۔ اقبال کا مردِ مومن ہر جہد میں باتسخیر ہے۔ وہ اصولوں کی مملکت میں بھی فاتح ہے۔ سلطنت علم میں بھی سرفہرست ہے۔ اس کے پاس خودی کی تیز دھار بھی ہے۔ وہ خوددار اتنا ہے کہ طائرِ فکر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اقلیمِ تن کا بھی حکمراں ہے۔ حادثات اس کے تابع ہیں۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ کی گرم بازاری میں موت بھی اس سے ڈر کر بھاگتی ہے۔ وہ عالمِ پست یعنی زمین

کی بہ نسبت عالمِ بالا پر زیادہ حکمراں ہے۔

چھپتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبرئیل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

مومن ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ صاحب لولاک ہو۔ صاحب لولاک وہی ہے جو چاند کے دو ٹکڑے کر سکے، غروب آفتاب کو طلوع آفتاب میں بدل سکے۔ اقبالؔ کے نظریئے سے دیکھا جائے تو کتنے صاحب لولاک نکلیں گے؟ اقبالؔ اپنی وارداتی کیفیت کو جنوں سے تعبیر کرتا ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبالؔ کا جنون مردِ مومن کے مختلف روپ دکھاتا ہے۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

تاریخِ کائنات میں کتنے اللہ کے شیر ملتے ہیں؟ واضح رہے کہ اسد اللہ تو ایک ہی نظر آتا ہے اور وہ سوائے مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن طالبؑ شاگرد سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا نہیں۔

اقبالؔ کے یہاں مومن کے جزوی صفات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن جزوی صفات صرف جزوی مومن کے یہاں ہوتی ہیں۔ جلد ہی اقبالؔ کا نظریۂ ارتقا اپنے وارداتی تسلسل کے اعتبار سے ایک منفرد شخصیت کو واضح کر دیتا ہے۔ اسمِ علی مرتضیٰ اقبالؔ کو تسخیر کی ضمانت نظر آتا ہے۔

چوں علیؑ در ساز بانانِ شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر

بے شک صرف نانِ شعیر پر بسر کر لینا قید عناصر سے کسی حد تک فرار ہے ....مگر فقط یہ فرار یہ قناعت یا کسبِ حلال کوئی شئے نہیں.......اس سے کمزور دل راہب تو پیدا ہو سکتے ہیں، غیرتِ رُستم و نریمان نہیں۔ نان شعیر پر بسر کرنے والوں کی تعداد لاکھوں ہے لیکن کیا کوئی اسد کردگار، مادر گیتی نے کبھی بھی اس طرح جنم دیا ہے۔ اقبالؔ پکار اٹھتا ہے ۔

ہزار خیبر و صد گو نہ اژدر است ایں جا
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدریؑ داند

نانِ جویں سے قوتِ حیدریؑ فراہم کرنے کے لئے کسی خاص جوہر کی ضرورت ہے اور یہی شرطِ تسخیر ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؑ

مگر اس شرر کی تلاش کے لئے کسی وسیلے کی ضرورت ہے۔

اقبالؔ اپنی تمام تر خرد صرف کر دیتا ہے۔ خرد ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتی ہے۔ لیکن اس راز کو حل نہیں کر پاتی۔ نتیجتاً اقبالؔ خرد کو خود سے سلام کرتا ہے اور اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے۔

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدریؑ کافی
ترے نصیب فلاطون کی تیزیِ ادراک

اقبالؔ گہری بصیرت اور اُمید کے ساتھ اس شرر یا قوتِ حیدریؑ کا مطالعہ کرتا ہے۔ تب اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ یہ ایک ازلی قوت ہے۔ اس کو فنا نہیں، یہ ہر زمان و مکان میں مصروف ہے۔ یہ اتنی گراں قدر اور بیش بہا ہے کہ دُنیوی سطوت و سلطنت اس کے مقابلے خس و خاشاک سے بھی کم درجہ رکھتی ہیں۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدُ اللہی

یا

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہوتو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؑ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ

یا

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؑ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

....

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدریؑ و کراری
نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسداللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی مولا علیؑ خیبر شکن عشق

جو کام عصائے حضرت موسیٰؑ کرتا ہے وہی کچھ اقبالؔ کو پنجۂ حیدرؑ میں نظر آتا ہے۔ لیکن پنجۂ حیدریؑ جوہردار ہے ؎

در کفِ موسیٰؑ ہمیں شمشیر بود
کارِ اُو بالا تر از تدبیر بود
سینۂ دریائے اَحمر چاک کرد
قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیرؓ بود
قوت بازاو ہمیں شمشیر بود

اقبالؔ تسخیر کے راز کو پا رہا ہے۔ یہ ہمہ گیر قوت ہر جگہ مصروفِ کار ہے۔ خیبر و نیل کی تخصیص نہیں جس انسان میں بھی قوت ہے وہ ایک خاص مرتبہ و مقام کا مالک ہے۔ وہ کائنات کے جس حصے پر بھی ضرب لگائے گا اس کی ضرب کاری ہوگی ؎

پیش او نہ آسماں نہ خیبر است
ضربت از اُو مقامِ حیدرؓ است
آفتابش را زوالے نیست نیست
منکر اُو راکمالے نیست نیست

رحمتِ حق صحبت، اصرار اُو
قہر یزداں ضربتِ کرّار اُو

اقبالؔ اسی قوت کو ایک اور نام سے موسوم کرتا ہے۔ وہ اسے عشق بھی کہہ کر پکارتا ہے ؎

عشق بانانِ جویں خیبر گشاد
عشق در اندامِ مَہ چاکے نہاد

اقبالؔ کی آرزوئیں مچلنے لگتی ہیں۔ وہ قوتِ حیدری یا عشق کا طالب نظر آنے لگتا ہے اور خدائے لَم یزل کے حضور دستِ دعا بلند کرتا ہے ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

کبھی اس طرح کہتا ہے ؎

بدہ اُو را جوان پاکبازے
سرورِ شے از شراب خانہ سازے
قوی بازوئے اُو مانند حیدرؓ
دلِ اُو از دو گیتی بے نیازے

اور کبھی اس طرح ؎

کور را بینندہ از دیدار کن
بو لہب را حیدرؓ کرّار کن

اس کے بعد جلد ہی اقبالؔ کی تمام آرزوئیں پائمال ہو جاتی ہیں اور بصیرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے وارداتِ قلبیہ اور بھی نکھر آتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ عشق یا قوتِ حیدرؓ اتنی عام شے نہیں کہ ہر کس و ناکس کو عطا ہو جائے۔ اس کے لئے تو بڑے بڑے ترستے رہتے ہیں ؎

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی

اقبالؔ اب تخصیص کر رہا ہے ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

مگر عشق یداللّٰہی کا معیار ہی اور ہے۔ وہ عشق پر فائق ہے۔ وہ صرف آتشِ نمرود میں کودنے والا نہیں بلکہ عرب کی آتشِ شمشیر میں بے خطر سونے والا عشق ہے۔ اقبالؔ اسی عشق کا موازنہ ایک دوسرے انداز سے کرتا ہے ؎

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اپنی بے مائیگی، بے بسی اور کم تری.........اور قوتِ حیدرؓ کی نایابی اور برتری دیکھ کر اقبالؔ کی قلبی کیفیات اپنا انداز تخاطب تبدیل کر دیتی ہیں۔ اقبالؔ انتہائی محتاط اور مقام شناس نظر آتے ہیں۔ ان کی دعا کی کیفیت بدل جاتی ہے۔

گلستانِ ز خاک من بر انگیز
نم چشم بہ خونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؑ را
نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؑ تیز

کہاں اقبالؔ زورِ حیدرؓ اور بازوئے حیدرؓ یوں ہی ہاتھ پھیلا کر طلب کر رہے تھے اور کہاں اب تیغ علیؑ بھی مانگتے ہوئے تذبذب ہو رہا ہے۔

گو کہ شمشیر علیؑ اور زور حیدرؓ بالکل مختلف چیزیں ہیں لیکن ہر وہ تیغ بھی اقبالؔ کے لئے جھجک پیدا کر رہی ہے جسے دست حیدرؓ نے مَس کیا ہو۔ اقبالؔ واقف ہیں کہ پارس، لوہے کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔ اس لئے وہ صرف نگاہ مانگ رہا ہے۔ وہ نگاہ جو شمشیر علیؑ کی طرح جوش رکھتی ہو۔

اب اقبالؔ عرفان و آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے اس کے اندازِ تخاطب کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق، ہمچو جانِ عالم است
ہستی اُو ظلِ اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگاہ بود
در جہاں قائم بامر اللہ بود
پختہ ساز و فطرت ہر خام را
از حرم بیروں کند اصنام را
نغمہ را تارِ دل از مضرابِ اُو
بہرِ حق بیداریٔ او خوابِ او

اقبآل اسی مردِ مومن، صاحبِ فقر، صاحبِ عشق، صاحبِ سیف، صاحبِ قلم، قوی بازو، جان باز اور صاحبِ تسخیر کو ایک نئے رنگ میں دیکھ رہا ہے۔ اقبآل کا مردِ مومن، نائبِ حق ہے، جانِ عالم ہے، ظلِ اسمِ اعظم ہے، اس کی بیداری اور خواب بہر حق ہے، وہ حرم سے بتوں کو نکال رہا ہے۔

اقبآل پر وجد طاری ہے اور عقیدت گزاری اور نیاز مندی سے یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اور کبھی کہتا ہے۔

میں بندہ اَور کا ہوں، امتِ شاہِ ولایت ہوں

اور کبھی یہ انداز اپناتا ہے۔

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ ہے مرا کعبہ

اور کبھی ۔

بندۂ شاہِ لا فتٰی ہوں میں

یہ ہے اقبالؔ فیضِ یادِ، نامِ مرتضٰی جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لا مکاں تک ہے

اقبالؔ اپنے اس مردِ مومن اور آئیڈیل کو تاریخ میں تلاش کر لیتا ہے اور کھل کر رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ ''اسرارِ خودی'' میں اپنی لَے کو تیز کر دیتا ہے اور بہت واضح طور پر کہتا ہے ۔

مسلم اوّل شہ مرداں علیؑ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ

از ولائے دود مانش زندہ اَم
در جہاں مثلِ گُہر تابندہ اَم

نرگسم وارفتۂ نظارہ اَم
در خیابانش چو بو آوارہ اَم

زمزم از جو شد ز خاک من ازوست
مئے اگر ریزد ز تاک من ازوست

خاکم او از مہر اُو آئینہ اَم
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

از رُخِ ادفالِ پیغمبرؐ گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فر گرفت

قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اَش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اَش

مرسلِ حق کرد ناش بو تراب
حق اے ید اللہ خواند در اُم الکتاب

ذاتِ او دروازۂ شہر علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

اقبالؔ نے اپنے مردِ مومن کے لئے حضرت علیؑ کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ ان میں علم، عشق اور عمل تینوں خوبیاں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں۔ اس لئے..... اقبالؔ اسرارِ خودی کی تمام تر اساس اسمائے علی المرتضیٰ پر قائم کرتا ہے۔ یہی اس کے کلام کی انتہا ہے۔ اقبالؔ یہاں پہنچ کر اپنے احساسات اور واردات کو ہم رنگ بنالیتا ہے۔ اپنے مردِ مومن کے تعارف کے بعد اقبالؔ اس کی شخصیت میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ تجلّیات کی ایک روانی دیکھتا ہے اور اپنی ذات کو اسی روانی کے لطف و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہی اقبالؔ کے کمال کا حاصل ہے۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا

اے بابِ مدینۂ محبت
اے نوحِ سفینۂ محبت

اے ماحی نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبر دلِ من

اے سِرِّ خط وجوب و امکاں
تفسیر تو سورۃ ہائے قرآں

اے مذہب عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے

اے　سرّ　نبوتِ　محمدؐ

اے　وصف　تو　مدحتِ　محمدؐ

جانم　بہ　غلامیِ　تو　خوشتر

سر　بر　زدہ　اَم　ز　جیبِ　قنبرؓ

از　ہوش　شدم　مگر　بہ　ہوشم

گوئی　کہ　نصیریؑ　خموشم

دانم　کہ　ادب　بہ　ضبط　راز　است

در　پردۂ　خامشی　نیاز　است

ز　اندیشۂ　عاقبت　رمیدم

جنسِ　غمِ　آلِ　تو　خریدم

از　جلوۂ　عام　بے　نیازم

سوزم،　گریم،　تپم　گدازم [1]

اقبالؔ اپنی تلاش وجستجو کے سہارے اپنی آرزو تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ سوائے اس ایک مقصود کے کائنات کی ہر شے سے بے نیاز ہے۔ اس کی خودی کی تکمیل اس کے مردمومنؔ کی غلامی میں مضمر ہے اور یہی اقبالؔ کے تجسس کی منزل ہے۔

﴿۴﴾

جوشؔ کا عقیدۂ مذہب

اس سے انکار نہیں کہ جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت بڑی متنازعہ فیہ رہی ہے لیکن معلوم نہیں وہ کیسے لوگ ہیں جو یہ بھول جاتے ہیں کہ جوشؔ انسان ہیں، فرشتہ نہیں۔ ان میں جہاں کمزوریاں ہیں وہاں بلندیاں بھی ہیں۔ مگر صرف کمزوریوں کو اُجاگر کرنا اور حاشیہ آرائی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ دراصل انسانی زندگی کا مطالعہ بڑا دل کش ہوتا ہے۔ خاص طور سے کسی فن کار، شاعر وادیب کی زندگی کا۔ ان کی زندگیاں مختلف خانوں میں منقسم ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی حیات کو صرف تعصب کی عینک لگا کر اور ایک ہی زاویے سے دیکھنا گمراہ کن ہوگا۔ ان کی حیات کے مختلف رویّوں کو سمجھنا اور پرکھنا ضروری ہے۔

جوشؔ نے جاگیردارانہ نظام میں آنکھیں کھولیں۔ وہ افغانی النسل تھے۔ لہٰذا اگر صرف اُن کی زندگی کے اُنھیں پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کے بحث کی جائے اور اُن کی شخصیت اُسی میں معمور کر دی جائے تو غلطیاں ڈیرے ڈال دیں گی، یا اگر اُن کی زندگی کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو ہی ڈھونڈ کر پیش کیا جائے گا تو بھی صحیح مطالعہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ بالغ نظر حضرات انصاف سے کام لے کر جوشؔ کی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو کھلے ذہن ودماغ سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کریں

کیونکہ زندگی کی مطالعے اور شخصیت کی پرکھ کے لیے کوئی میکانیکی عمل مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے فطری اور جذباتی تقاضوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے اور جوشؔ کی شخصیت فطری وجذباتی تقاضوں کی حسین جولاں گاہ ہے۔

شاعر، ادیب اور فن کار کے اعمال، اطوار، حرکات وسکنات، نظریات اور رجحانات وغیرہ نشیب وفراز زمانہ سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ جوشؔ کی شخصیت کی تعمیر میں بھی اس طرح کے نشیب وفراز زمانہ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ جوشؔ کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں خارجی، داخلی، شعوری، غیر شعوری، نفسیاتی اور مادی عمل اور ردِ عمل کے بڑے نادر ونایاب نمونے ملتے ہیں جس کی تفصیل اس مختصر مقالے میں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس ذیل میں کچھ تفصیل راقم السطور اپنی تصنیف ''شاعرِ آخرالزماں- جوشؔ ملیح آبادی'' مطبوعہ ۱۹۸۲ء میں پیش کر چکا ہے۔

ہاں! ادھر ایک طبقہ اور خاص طور سے اسلام کے ٹھیکیداروں نے جوشؔ کے کفر والحاد پر بڑا زور دیا اور اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی کہ جوشؔ کو ملحد اور کافر ثابت کر دینا بڑے ثواب کی بات ہو گی اور گویا پیش خدا ایک بڑا کارنامہ باعث نجات ہو جائے گا۔ حالانکہ کلام جوشؔ کے آئینے میں وہ توحید پرست اور عارفِ رسالت نظر آتے ہیں۔ وہ مشیت خداوندی میں بھی یقین رکھتے ہیں۔

تم سے چھڑا رہا ہے زمانہ بہار میں
کیا دخل ہے مشیت پروردگار میں

یا

جو مقدر میں ہے وہ ہو کے رہے گا اے جوشؔ
آپ کیوں دل کو پریشان کیے بیٹھے ہیں

ان اشعار سے کیا جوشؔ کے عقیدہ کو سمجھا جا سکتا ہے؟ وہ مسئلہ جبر وقدر اور قضاوقدر الٰہی میں یقین رکھتے ہیں۔ اس باب میں تمکین کاظمی کا بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''بعض باتیں دنیا میں عجیب وغریب دیکھنے میں آتی ہیں۔ وحید الدین سلیم اور عبدالحق باوجودیکہ ملحد اور مکمل دہریہ ہونے کے مولوی اور مولانا اور مقدس بنے رہے اور لوگ ان کو مذہبی اور مسلمان سمجھ کر پوجتے رہے بلکہ اب تک پوجتے ہیں اور نیاز فتحپوری اور جوشؔ ملیح آبادی باوجود مسلمان ہونے اور پکے مسلمان ہونے کے ملحد اور دہریہ کہلاتے رہے اور اب بھی کہلاتے ہیں۔ میں چونکہ ان چاروں سے واقف ہوں بلکہ بہت زیادہ واقف ہوں۔ اس لیے حیران ہوں کہ یہ کیا بوالعجبی ہے۔
>
> ایک روز صبح صبح میں جوشؔ کے گھر پہنچا۔ جوشؔ صبح کی چہل قدمی کرکے اسی وقت واپس ہوئے تھے۔ ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے، جوشؔ ناشتہ کر رہے تھے اور میں چائے پی رہا تھا۔ ایک اندھا شخص سورۂ رحمٰن کی تلاوت فقیرانہ انداز سے زور زور سے کرتا ہوا سڑک پر سے گزرا۔ جوشؔ کی رگ حمیت پھڑکی۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ جسم میں رعشہ پیدا ہوگیا فی البدیہہ کہا۔
>
> اک گدا کی زباں پہ ہے قرآں
> واہ کیا شانِ کبریائی ہے
> کل جو دیہیم تختِ شاہی تھا
> آج وہ کاسۂ گدائی ہے

یہ شعر اُن کی منہ سے ادا ہو رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ دیر تک کیفیت رہی۔ بڑی مشکل سے سنبھلے۔

غور فرمایئے ایک ملحد، ایک کافر، ایک دہریہ یہ قطعہ کہتا ہے اور کتنا متاثر ہو کر کہتا ہے۔

یہ قطعہ اور اس کا شانِ نزول میں نے اسی روز دوپہر میں مولانا عبداللہ عمادی کو سنایا تو مولانا آبدیدہ ہو گئے اور دیر تک جوشؔ کو دعائیں دیتے رہے۔"[1]

آیئے جوشؔ کے دل کی گہرائیوں میں الوہیت کا فطری جذبہ دیکھئے اور انصاف سے فیصلہ کیجیے ۔

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے
اللہ کو قہار بتانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

آگے بڑھ کر والہانہ انداز میں جوشؔ رحمتِ الٰہی کا قصیدہ کچھ اس طرح پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ عتاب الٰہی بھی ہنس پڑتا ہے۔

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

ذاتِ سرورِ کونین علیہ صلی اللہ و آلہٖ وسلم سے اُن کی عقیدت اور مودت اظہر من الشمس ہے۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری

خشک عرب کی ریگ سے لہر اٹھی نیاز کی
قلزم ناز حسن میں اُف رے تری شناوری
چھین لیں تو نے مجلسِ شرک وخودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکر لات وہبل میں تھرتھری
تیرے سخن سے دب گئے لاف وگزاف کفر کے
تیرے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتح خیبری
تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا
تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہ قیصری

یہ نظم بحضور سرور کائنات' ۱۲۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ صرف چند اشعار پر ہی اکتفا کی جاتی ہے اس میں عجیب والہانہ پن ہے اور جوش آہ وزاری کررہے ہیں۔ اس کے ہر شعر ایک فطری جذبہ اور عقیدت کے مظہر ہیں۔ جوش کس شان سے سرورِ کائنات کے حضور میں ملتجی ہیں۔

یہاں چند نمونے مزید پیش کیے دیتا ہوں تاکہ گورنگا ہوں کو روشنی حاصل ہوسکے۔

جو تجھ سے آشنا ہے وہ جوہر شناس ہے
تیری زبان، ذہنِ بشر کا لباس ہے

نوعِ انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام
مردِ غازی کا کفن ہے خلعتِ عمرِ دوام
نصب کس نے کر دیے مقتل میں حوروں کے خیام
جانتے ہو، اُس دبیر ذہن انسانی کا نام
جو انوکھی فکر تھا جو اک نیا پیغام تھا
اُس حکیمِ نکتہ پرور کا محمدؐ نام تھا

ع: ''نصب کس نے کر دیے مقتل میں حوروں کے خیام'' میں سورۂ رحمٰن کی ۷۲ویں آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشادِ ربانی ہے۔ ''حُورٌ مقصوراتٌ فی الخیام ہ''

اس اجمالی تعارف اور مقدمہ کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں کہ کلام جوشؔ سے مزید ان کی وحدت پرستی اور رسالت پر ایمان کی مثالیں پیش کر سکوں۔ کیا جتنی مثالیں دی گئی ہیں وہ کافی نہیں؟

اچھا ایک بات اور سن لیجیے۔ دراصل اسلام میں آیاتِ واضحہ اور احادیثِ صحیحہ[۲] سے یہ استنباط و استخراج ہوتا ہے کہ مغفرت کا معیار وہ عقائد ہوتے ہیں جو حجتِ قاطعہ کی مدد سے سمجھنے کے بعد انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ حق العباد میں ماخوذ نہ ہو۔ جوشؔ نے اپنے عقائد ''یادوں کی برات'' میں تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر ہر شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ایسے ہی خیالات کے انسان کو ''مردِ مومن'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ بزرگ و برتر بڑا رحیم و کریم اور غفار و غفور ہے۔ اس کی بارگاہ میں خصوصیت کے ساتھ ہر وہ شخص جس نے صدق دل سے اپنے قلم کے ذریعے انسانوں کے مسائل دینی و دنیاوی میں رہنمائی کی ہو سب سے پہلے نجات کا مستحق ہے۔[۳]

جوشؔ کی صرف ایک ہی بیت تمام دنیا کے انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کے لیے کافی ہے اور اس میں دین حق کی تابانیاں مضمر ہیں۔

بدلے کی رسم دینِ وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

جوشؔ نے اپنے، مراثی میں سرورِ انبیاء اور فخرِ انسانیت کی شان مبارک میں جو خیالات نظم کیے ہیں وہ گہرے تفکر اور تفلسف کا نتیجہ ہیں۔ صرف روایتی انداز اور مضامین نہیں۔ جوشؔ، سرکارِ عالم کو رسولؐ، رسالت پناہ، محمدؐ عربی، پیمبر آفاق، رحمت اللعالمین، دیرِ ذہن انسانی، حکیم نکتہ پرور، خطیب اوجِ فاراں، مصطفےٰ، سوار توسنِ وقتِ رواں، طبیب فطرت نباضِ جاں، فقیہ نفس ونقادِ جہاں تسلیم کیا ہے۔ یہ تراکیب ان کے مرثیوں میں موجود ہیں۔ چند بند اور مصرعے ملاحظہ ہوں۔

گھومی کلیدِ فضل، کھلا قُفل فیضِ عام
ناگاہ آسمان پہ گونجا زمیں کا نام
گردش میں آئے نعرۂ صلِّ علیٰ کے جام
پڑھتے ہوئے درود بڑھے انبیاء تمام
کعبے کے گرد ایک کرن گھومنے لگی
روحِ محمدؐ عربی جھومنے لگی

آبِ مکاں، امامِ زماں، آیۂ مبیں
کنزِ علوم، کاشفِ سِر، کعبۂ یقیں
قاضیِ دہر، قبلۂ دوراں، قوامِ دیں
منشائے عصر، معنیِ کن، میرِ عالمیں

تابندگیٔ طرۂ طرفِ کلاہِ علم
مولائے جاں، رسولِ تمدن، الٰہِ علم

تجھ سے جو آشنا ہے وہ جوہر شناس ہے
تیری زباں، ذہنِ بشر کا لباس ہے

....

غلطیدہ آسماں پہ خمستاں کی روشنی
اور خم کدے پہ عترت و قرآں کی روشنی
قرآن پر رسولؐ کے داماں کی روشنی
اور چہرۂ رسولؐ پہ یزداں کی روشنی
یزداں کی روشنی کا تموج قلوب میں
اک سیل رنگ و نور شمال و جنوب میں

....

نوعِ انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام
مردِ غازی کا کفن ہے خلعتِ عمرِ دوام
نصب کس نے کردیئے مقتل میں حوروں کے خیام
جانتے ہو اس دبیرِ ذہنِ انسانی کا نام
جو انوکھی فکر تھا، جو اک نیا پیغام تھا
اُس حکیم نکتہ پرور کا محمدؐ نام تھا

ع ''نصب کس نے کردیئے مقتل میں حوروں کے خیام'' میں سورۂ رحمٰن کی بہترویں آیت کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں ارشادِ ربانی ہے۔ ''حُورٌ مقصوراتٌ فی الخیام'' دوسرا بند پیش ہے۔

اے محمدؐ ! اے سوارِ توسن وقتِ رواں
اے محمدؐ! اے طبیب فطرتِ نباض جاں
اے محمدؐ! اے فقیہِ نفس و نقادِ جہاں
موت کو تو نے وہ بخشی آب و تابِ جاوداں

زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغامِ اجل کی آرزو کرنے لگے

اس بیت میں عربوں کی تاریخ اور ان کی طمعِ دنیا،لہو ولعب کا اشارہ کرنے کے بعد اسلام کی آمد اور اس کی برکات کے اثرات دکھائے گئے ہیں۔ بیت کا دوسرا مصرعہ ''لوگ پیغام اجل کی آرزو کرنے لگے'' میں سورہ جمعہ کی آیت فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ہ کی طرف بڑا بلیغ اشارہ ہے۔

اس قدر عجلت سے تو روئے زمیں پر چھا گیا
مدعی چکرا گئے، تاریخ کو غش آ گیا

فرمانِ رسولؐ نے ایک انقلاب پیدا کر دیا اور لوگوں کے مزاج تبدیل کر دیئے۔ ملاحظہ ہو:

کشتیاں چلوائیں طوفاں سے ترے فرمان نے
موت بوئی زندگی کاٹی ترے قرآن نے

....

موت کی ظلمت میں تو نے جگمگا دی زندگی
جوہرِ شمشیر عریاں میں دکھا دی زندگی
شمع کی مانند قبروں میں جلا دی زندگی
سرزمینِ مرگ پر تو نے اُگا دی زندگی

حبس ٹوٹا باغِ جنت کی ہوا آنے لگی
مقبروں سے دل دھڑکنے کی صدا آنے لگی
خاک کے ذرات کو تو نے ثریا کر دیا
آگ کو پانی کیا پانی کو صہبا کر دیا
موت سی کالی بلا کو رشکِ سلمٰی کر دیا
آخری ہچکی کو گلبانگِ مسیحا کر دیا
سر سے خوفِ نیستی کی یوں بلائیں ٹال دیں
آدمی نے موت کی گردن میں بانہیں ڈال دیں

ظاہر ہے کہ یہ فلسفہ اسلام اور رسولؐ اسلام نے ہی بخشا کہ راہِ حق وصداقت میں مرنے والا شہید اور مارنے والا غازی ہوتا ہے۔ اسی فکر کو جوشؔ نے درج بالا بند میں نظم کیا ہے۔

اذان

افق سے سحر مسکرانے لگی
مؤذن کی آواز آنے لگی
یہ آوازہ ہر چند فرسودہ ہے
جہاں سوز صدیوں سے آسودہ ہے
مگر اس کی ہر سانس میں مستقل
دھڑکتا ہے اب تک محمدؐ کا دل

(فکر ونشاط ۱۹۲۸ء)

اس ذیل میں مائل ملیح آبادی نے بڑا دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے (جوش سے) پوچھا، آپ نے دنیا کے جن شاعروں کا کلام پڑھا ہے ان میں کسی کے کلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے ہیں؟''

جوش صاحب نے جواب دیا۔''میں نے کسی شاعر کا کبھی مقابلہ نہیں کیا ہے۔ ہاں سورۂ رحمٰن کا جواب لکھنے کی بار بار کوشش کی ہے مگر ہر مرتبہ شکست کھا کر خاموش ہو گیا ہوں۔'' کب تک اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا۔'' اس نظم کو کبھی ''سورۂ رحمٰن'' کا جواب سمجھتا تھا۔ اب پڑھتا ہوں تو اپنی نادانی پر حیرت ہوتی ہے۔'' میں نے پوچھا،'' کیا آپ پھر کبھی اس موضوع پر لکھنے کی کوشش کریں گے؟'' ۔''نہیں''۔ انھوں نے جواب دیا۔'' وہاں الفاظ اور فصاحت و بلاغت کا دریا بہہ رہا ہے۔ ایک ایک لفظ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ میرے پاس نہ وہ الفاظ ہیں اور نہ زبان۔''[۳]

مائل ملیح آبادی کے اس بیان سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جوش اعجاز قرآنی کے قائل تھے اور وہ ہمیشہ حق کے گیت کفر کے انداز میں گاتے رہے۔ مزید چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا
خدا وہ ہے جو حدِ عقل میں آ ہی نہیں سکتا

انسان کی عقل، علم اور نظر سب محدود ہے اور ذات خداوندی لامحدود ہے۔ لامحدود، محدود میں نہیں آسکتا۔

سمجھ میں آئے گا اک عمر کے بعد
میں جو کچھ ہم نشیں سمجھا رہا ہوں
نہ جا ان کفر کی باتوں پہ میری
یہ حق کے گیت ہیں جو گا رہا ہوں

وہ اسم میں نہیں ذات میں یقین اور عقیدہ رکھتے تھے۔

اُسی کے نام کو تاریک کر کے
اُسی کی ذات کو جھٹلا رہا ہوں

❀❀❀

---

[1] افکار جوش نمبر ص: ۱۷۱

[2] صحیح بخاری۔ باب العقول، اصول کافی

[3] مرثیۂ جوش، تعارف مولوی نسیم امروہوی

[4] شمیر بے نیام۔ شاخ گل، مائل ملیح آبادی، ۔ ہفتہ وار ضمیمہ قومی آواز، ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء

مقدمہ انتخاب کلیات جوشؔ ملیح آبادی

اس سے انکار نہیں کہ جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت بڑی متنازعہ فیہ رہی ہے لیکن معلوم نہیں وہ کیسے لوگ ہیں جو یہ بھول جاتے ہیں کہ جوشؔ انسان ہیں، فرشتہ نہیں۔ اُن میں جہاں کمزوریاں ہیں وہاں بلندیاں بھی ہیں۔ مگر صرف کمزوریوں کو اُجاگر کرنا اور حاشیہ آرائی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں دراصل انسانی زندگی کا مطالعہ بڑا دل کش ہوتا ہے۔ خاص طور سے کسی فن کار، شاعر اور ادیب کی زندگی کا۔ اُن کی زندگیاں مختلف خانوں میں منقسم ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی حیات کو صرف تعصب کی عینک لگا کر اور ایک ہی زاویے سے دیکھنا گمراہ کن ہوگا۔ اُن کی حیات کے مختلف رویوں کو سمجھنا اور پرکھنا ضروری ہے۔

جوشؔ نے جاگیردارانہ نظام میں آنکھیں کھولیں۔ وہ افغانی النسل تھے۔ لہٰذا اگر صرف اُن کی زندگی کے اُنھیں پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کے بحث کی جائے اور اُن کی شخصیت اسی میں محصور کی دی جائے تو غلطیاں ڈیرے ڈال دیں گی، یا اگر ان کی زندگی کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو ہی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کیا جائے گا تو بھی صحیح مطالعہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ بالغ نظر حضرات انصاف سے کام لے کر جوش کی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو کھلے ذہن و دماغ سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کریں کیونکہ زندگی کے مطالعے اور شخصیت کی پرکھ کے لیے کوئی میکانیکی عمل مفید نہیں ہو سکتا۔ اس

کے لیے فطری اور جذباتی تقاضوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اور جوشؔ کی شخصیت فطری وجذباتی تقاضوں کی حسین جولاں گاہ ہے۔

شاعر ادیب اور فن کار کے اعمال، اطوار، حرکات وسکنات نظریات اور رجحانات وغیرہ نشیب وفراز زمانہ سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ جوشؔ کی شخصیت کی تعمیر میں بھی اس طرح نشیب وفراز کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ جوشؔ کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں خارجی، داخلی، شعوری، غیر شعوری نفسیاتی اور مادّی عمل اور ردِ عمل کے بڑے نادر ونایاب نمونے ملتے ہیں۔ جس کی تفصیل اس مختصر مقدمہ میں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس ذیل میں کچھ تفصیل راقم السطور اپنی تصنیف ''شاعر آخرالزماں.......جوش ملیح آبادی'' مطبوعہ ۱۹۸۲ء میں پیش کر چکا ہے۔

ہاں! ادھر ایک طبقہ اور خاص طور سے اسلام کے ٹھیکیداروں نے جوش کے کفر والحاد پر بڑا زور دیا ہے۔ اور اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی کہ جوش کو ملحد اور کافر ثابت کر دینا بڑے ثواب کی بات ہوگی اور گویا پیش خدا ایک بڑا کارنامہ باعث نجات ہو جائے گا۔ حالانکہ کلام جوش کے آئینے میں وہ توحید پرست اور عارف رسالت نظر آتے ہیں۔ وہ مشیت خداوندی میں بھی یقین رکھتے ہیں۔

تم سے چھڑا رہا ہے زمانہ بہار میں
کیا دخل ہے مشیت پروردگار میں

یا

جو مقدر میں ہے وہ ہو کے رہے گا اے جوشؔ
آپ کیوں دل کو پریشان کیے بیٹھے ہیں

ان اشعار سے کیا جوش کے عقیدہ کو سمجھا نہیں جا سکتا؟ وہ مسئلہ جبر وقدر اور

قضا و قدرِ الٰہی میں یقین رکھتے ہیں۔ اس باب میں تمکین کاظمی کا بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعض باتیں دُنیا میں عجیب وغریب دیکھنے میں آتی ہیں ...وحید الدین سلیم اور عبدالحق باوجود یہ کہ ملحد اور مکمل دھریہ ہونے کے مولوی اور مولانا اور مقدس بنے رہے اور لوگ اُن کو مذہبی اور مسلمان سمجھ کر پوجتے رہے بلکہ اب تک پوجتے ہیں اور نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی باوجود مسلمان اور پکے مسلمان ہونے کے ملحد اور دھریہ کہلاتے رہے اور اب بھی کہلاتے ہیں۔ میں وں کہ ان چاروں سے واقف ہوں بلکہ بہت زیادہ واقف ہوں۔ اس لیے حیران ہوں کہ یہ کیا بوالعجبی ہے۔

ایک روز صبح صبح میں جوشؔ کے گھر پہنچا، جوشؔ صبح کی چہل قدمی کر کے اُسی وقت واپس ہوئے تھے۔ ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش ناشتہ کر رہے تھے اور میں چائے پی رہا تھا۔ ایک اندھا شخص ''سورہ رحمٰن'' کی تلاوت فقیرانہ انداز سے زور زور سے کرتا ہوا سڑک پر سے گزرا۔ جوشؔ کی رگ حمیت پھڑکی۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ جسم میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ فی البدیہہ کہا ۔

اِک گدا کی زباں پہ ہے قرآں
واہ کیا شانِ کبریائی ہے
کل جو دیہیم تختِ شاہی تھا
آج وہ کاسۂ گدائی ہے

یہ شعر اُن کے منہ سے ادا ہو رہے تھے اور آنکھوں سے

آنسو ٹپک رہے تھے۔ دیر تک کیفیت رہی بڑی مشکل سے سنبھلے۔

غور فرمایئے ایک ملحد، ایک کافر، ایک دہریہ یہ قطعہ کہتا ہے

اور کتنا متاثر ہو کر کہتا ہے۔

یہ قطعہ اور اس کا شانِ نزول میں نے اس روز دوپہر میں

مولانا عبداللہ عمادی کو سنایا تو مولانا آبدیدہ ہو گئے اور دیر تک جوش کو

دعائیں دیتے ہیں۔'' [1]

آیئے جوشؔ کے دل کی گہرائیوں میں الوہیت کا فطری جذبہ دیکھئے اور انصاف سے فیصلہ کیجئے۔

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے
اللہ کو قہار بتانے والو!
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

آگے بڑھ کر والہانہ انداز میں جوش رحمت الٰہی کا قصیدہ کچھ اس طرح پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ عتاب الٰہی بھی ہنس پڑتا ہے۔

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

ذات سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کی عقیدت اور مودت اظہر من الشمس ہے۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آزری

خشک عرب کی ریگ سے لہر اُٹھی نیاز کی
قلزم نازِ حسن میں اُف رے تری شناوری
چھین لیں تو نے مجلس شرک وخودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکر لات ہُبل میں تھرتھری
تیرے سخن سے دب گئے لاف وگزاف کفر کے
تیرے نفس سے بجھ گئی آتش سحر سامری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری
تیرے فقیر اور دیں، کوچۂ کفر میں صدا
تیرے غلام اور کریں اہل جفا کی چاکری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہ قیصری

یہ نظم ''بحضور سرور کائنات'' ۱۲۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ صرف چند اشعار پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔ اس میں عجیب والہانہ پن ہے اور جوش آہ وزاری کر رہے ہیں۔ اُس کے ہر شعر ایک فطری جذبہ اور عقیدت کے مظہر ہیں۔ جوش کس شان سے سرور کائنات کے حضور میں ملتجی ہیں۔

یہاں چند نمونے مزید پیش کیے دیتا ہوں تاکہ کورنگاہوں کو روشنی حاصل ہو سکے۔

جو تجھ سے آشنا ہے وہ جوہر شناس ہے
تیری زبان، ذہن بشر کا لباس ہے

....

نوعِ انسان کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام
مرد غازی کا کفن ہے ، خلعت عمر دوام
نصب کس نے کر دیے مقتل میں حوروں کے خیام
جانتے ہو، اُس دبیرِ ذہن انسانی کا نام
جو انوکھی فکر تھا، جو اک نیا پیغام تھا
اُس حکیم نکتہ پرور کا محمد نام تھا

ع: ''نصب کس نے کر دیے مقتل میں حوروں کے خیام'' میں سورہ رحمٰن کی ۷۲ ویں آیت کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں ارشاد ربانی ہے:...... ''حورٌ مقصوراتٌ فی الخیام''

اس اجمالی تعارف اور مقدمہ کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں کہ کلام جوشؔ سے مزید اُن کی وحدت پرستی اور رسالت پر ایمان کی مثالیں پیش کر سکوں۔ کیا جتنی مثالیں دی گئی ہیں وہ کافی نہیں؟

اچھا ایک بات اور سن لیجئے۔ دراصل اسلام میں آیاتِ واضحہ اور احادیث صحیحہ [1] سے یہ استنباط و استخراج ہوتا ہے کہ مغفرت کا معیار وہ 'عقائد' ہوتے ہیں جو حجت قاطعہ کی مدد سے سمجھنے کے بعد انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ حق العباد میں ماخوذ نہ ہو۔ جوشؔ نے اپنے عقائد ''یادوں کی برات'' میں تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر ہر شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ایسے ہی خیالات کے انسان کو ''مردِ مومن'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ بزرگ و برتر بڑا رحیم و کریم اور غفار و غفور ہے۔ اس کی بارگاہ میں خصوصیت کے ساتھ ہر وہ شخص جس نے صدق دل سے اپنے قلم کے ذریعے انسانوں کی، مسائل دینی و دنیاوی میں رہنمائی کی ہو سب سے پہلے نجات کا مستحق ہے۔ [1]

جوشؔ کی صرف ایک ہی بیت تمام دنیا کے انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اور اُس میں دینِ حق کی تابانیاں مضمر ہیں ۔

بدلے کی رسم دین وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

جوشؔ خلوص و محبت کا پیکر تھے۔ وہ ایک بے قرار دل لے کر آئے تھے۔ وہ شاعری کی افادیت اور شاعر کے منصب سے بھی واقف تھے۔ اسی فرض شناسی نے انھیں ہمیشہ سرگرم عمل رکھا۔ وہ ایک بے غرض بے ریا اور بے لوث انسانوں کی طرح سب سے اُلفت رکھے تھے۔ اس لیے اُن کی شاعری میں ہر طبقے کے لوگوں کے لیے پیغام ملتا ہے اور ہر طبقے کے افراد اُن کے مخاطب ہیں۔ وہ قومی بیداری اور قومی شعور کی آبرو کو بڑھانا چاہتے تھے اسی لیے بے قرار ہو کر وہ قوم و ملک کے سبھی افراد کو صدا دیتے ہیں۔ ہم صفیرو اک ذرا آواز پر آواز دو'' کی تمنا رکھتے ہوئے تند و تیز لیکن پر خلوص لہجے میں کہتے ہیں۔ نازک اندامانِ کالج (طلبائے علی گڑھ) کی غیرت کو جھنجھوڑتے ہیں ۔

مانگ لی نسوانیت سے تو نے ہر شیریں ادا
مرحبا اے نازک اندامان کالج مرحبا

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جس کی دھمک سے خلفشار
شغلِ زینت سے مگر فرصت تمہیں ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کی نیچے زمیں ہلتی نہیں

کمزوروں، ضعیفوں اور ناتوانوں کو صدا دیتے ہیں ۔

کام ہے میرا تغیر ، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

غلاموں کو حوصلہ عطا کرتے ہوئے اُن کی غیرت وحمیت کو چیلنج کرتے ہیں۔

اے ہند کے ذلیل غلامانِ رو سیاہ
شاعر سے تو ملا دُ خدا کے لیے نگاہ

رفیقہ حیات سے گویا ہوئے تو یہ ارشادات ڈھل کر سامنے آئے۔

اے شریک زندگی اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائل جام و سبو
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرم فغاں
سبحہ و زُنار میں جکڑا ہوا ہندوستاں

مسلمان کے احساس کو جگاتے اور للکارتے ہیں۔

ہاں! خود زرہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک

ہندوؤں کو آواز دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

بازوئے زے: ناخدائی کے لیے تیار ہو
ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہوشیار ہو

اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو مشترکہ طور پر مخاطب کر کے بڑی صدق دلی سے کہتے ہیں۔

توڑ اس جال کو جکڑے ہے جو بازو ترے
بستۂ کشمکش سبحۂ زنار نہ بن

پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنس غلامی کا خریدار نہ بن

جوشؔ کی شاعری کے کئی رخ اور کئی ادوار ہیں۔ اس انتخاب میں یہ بہر طور کوشش کی گئی ہے کہ اُن کی شاعری کے مختلف جہات بروئے کار آ جائیں جوشؔ شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر شباب بھی۔ وہ انقلابی لہجے کو بڑی خوب صورتی اور دل کشی سے اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں اور شباب کی کیفیات کو بھی انتہائی جذباتی انداز سے نظم کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔

جوشؔ کی انقلابی شاعری کسی سیاسی تحریک کی دین نہیں۔ وہ ان کے قوی اور توانا احساس کی پیداوار ہے۔ اس لیے اس پر کسی سیاسی لیبل لگانے کی کوشش نہ کی جائے یہ خود ان کے شعور کا نتیجہ ہے۔ بعض حلقوں میں جوشؔ کی انقلابی شاعری کو خطابیہ لہجے کا اثر بتا کر کم تر درجہ کی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے گو کہ ایسا نہیں ہے۔ مگر خطابت بھی ایک فن ہے اور بڑا اہم اور مشکل فن ہے۔ یہ کوئی آسان نسخہ نہیں بلکہ بہت ہی ذہنی، علمی، ادبی اور نفسیاتی ذہانت اور ریاضت کا فن ہے۔ اسے ہر کس و ناکس نہیں برت سکتا ہے۔ علامہ ابن رُشد نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ''الخطابہ'' میں اس فن کے مختلف پہلوؤں سے دل چسپ بحث کی ہے۔ اُن کے مطابق:

> ''خطابت اُس فن کو کہتے ہیں جس کی مدد سے اپنی بات دوسروں سے موثر ڈھنگ سے منوائی جا سکے۔''

ویسے اس کے لغوی معنی ہیں وعظ کہنا یا خطبہ پڑھنا۔

> ''اخطب یخطب خطبة و خطباو خطابة اهی و عظقر الخطبة علی الحاضرین۔ یقال خطب القوم فی القوم۔''

انگریزی، عربی، اُردو اور فارسی وغیرہ میں اس فن سے متعلق بہت سی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں...... ''خطابت'' کے دو اہم قرینے بتائے گئے ہیں ۔

(۱) حقایقی

(۲) ابلاغی

''حقایقی'' سے ایسے واقعات اور حالات عبارت ہیں جن سے کسی مخصوص عمل یا روش کا اپنانا مخاطب کے لیے لازمی ہو جائے۔

''ابلاغی'' سے مراد..... اظہار خیال و مطالب کے لیے مناسب الفاظ، خصوصی اندازِ بیان اور منفرد لب ولہجہ ہے جس سے کہ بات آسانی سے پہنچ سکے۔

یعنی ایسا انداز جو دلوں کو گرمائے، کسی بات کی وضاحت کرے اور اسے باور کرانے میں مفید ہو، تاثیر پیدا کر کے سامعین اور ناظرین کو مخصوص عمل پر آمادہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

دراصل خطابت بڑا نازک اور مشکل فن ہے۔ یہ صلح کی طرف بھی مائل کر سکتی ہے اور آمادۂ پیکار بھی کر سکتی ہے۔ یہ شاخِ گل بھی ہے اور شمشیرِ بے نیام بھی۔ خطابت مردہ قوموں کو بیدار کرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ دلوں میں ولولہ اور حوصلہ بھی پیدا کرتی ہے۔ مصائب اور شدائد میں تسلی، تشفی کا موثر ذریعہ بھی بنتی ہے۔ صبر و ضبط و تحمل و استقلال کا درس بھی دیتی ہے اور سنان و شمشیر، تیر و تفنگ اُٹھانے کا حوصلہ بھی بخشتی ہے۔ نظام اخلاق کو درست کرتی ہے اور عظمت فکر نیز قوتِ عمل عطا کرتی ہے.... ایک لشکر جرار وہ کام نہیں کر سکتا جو ایک اچھا خطیب اپنی خطابت کے جوہر سے انجام دے سکتا ہے۔ جوش نے بھی خطابت اور خطابیہ اندازِ بیان اسی لیے اپنایا ہے اور ادب و خطابت کے قدیم اور اہم رشتوں کو استوار کیا ہے۔ جوش خطابت سے اپنے موضوع کی پوری

تشریح وتوضیح بڑی خوبی سے اور پر اثر طور پر کر دیتے ہیں۔ عربی شاعری کا طرۂ امتیاز یہی خطابیہ لہجہ رہا ہے جو رجز خوانی کے ذیل میں بار بار آتا ہے۔

جوش کی انقلابی نظموں میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے جس سے ان کی نظمیں دلوں میں نشتر کی طرح اُتر جاتی ہیں۔ بقول پروفیسر حنیف فوق:

> ''جوش کی باغیانہ عزم میں ڈھلی نظموں میں عربی شاعری کا رجزیہ آہنگ ملتا ہے لیکن ہندوستانی اصنامیات کی روایت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ''پیمانِ محکم'' میں جہاں موت سے جنگ کرنے والے اُن غازیوں کی قسم کھائی گئی ہے جن کے زخم اُپی تلوار کی بُرش سے بھرتے ہیں وہاں ''رام'' ''لچھمن'' اور ''ارجن'' کو بھی فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ ''بغاوت''.....اور ''نعرۂ شباب'' دونوں میں بجلی کی تیزی اور تلوار کی کاٹ ملتی ہے۔ جوش نے اپنے عصر کی روح کو اس آب وتاب سے پیش کیا ہے مستقبل کی آہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔''

جوش ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے علم بردار ہیں۔ وہ آزادی کو ہر حال اور ہر قیمت پر پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوم کو للکارتے ہیں۔ اُن کی انقلابی نظمیں جدوجہد آزادی کی مختلف سمت ورفتار کا اشاریہ ہیں۔ اُن میں کئی خوبصورت اور دل کش موڑ ہیں جسے اُن کا خطیبانہ لہجہ پر کیف اور پر اثر بنا دیتا ہے۔ وہ برطانوی جبر واستبداد کے خلاف، مہاجنی نظام کے خلاف، جاگیردارانہ نظام کے خلاف آگ برساتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جوش کے عہد اور ماحول پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں ہر طرح کا استحصال روا کر دیا گیا تھا۔ جبر و بربریت کے کالے

ناگ پھن پھیلائے ہوئے تھے۔ جوش کی انقلابی شاعری کی روح یہی ماحول اور زمانہ ہے جسے نظر انداز کر کے جوش کی تفہیم دُشوار ہو جائے گی۔

دراصل جوش کی انقلابی شاعری کا یہ سب سے نمایاں کارنامہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے ''کسان'' اور اُس کے ''ہل'' کو موضوع شاعری بنایا۔ اس کے قبل کسی بھی شاعر نے غریب، مفلس، سیاسی رتھ کے پہیوں میں کچلے ہوئے ''کسان'' اور اس کے ''ہل'' کو منہ نہیں لگایا تھا۔ جوش کی اس طرح کی موضوعاتی نظموں میں ہندوستان کے گاؤں اور دور دراز علاقے کی جمالیات کے توانا مرقعے بھی نگاہوں میں کھپ جاتے ہیں اور ایک اپنے پن کا احساس دلوں میں انگڑیاں لینے لگتا ہے۔ وہ انقلابی لب و لہجے میں شبابیات کی گلابی لنڈھاتے ہیں جس کی پھبن ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ اُن کی نظم ''جامن والیاں'' .... ''بدلی کا چاند'' یا............ ''فتنۂ خانقاہ'' ....وغیرہ اسی ''انقلابی اور شبابی'' کیفیت کے امتزاج کے ذیل میں آتی ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان نظموں میں ہمارا سماج جیتا جاگتا انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

جوش نے جدید مرثیہ کے آغاز میں بھی انتہائی اہم اور تاریخی رول ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا دبیر اور میر انیس نے اُردو مرثیہ کو اس بامِ عروج تک پہنچا دیا تھا جہاں سے مزید ترقی کے امکانات کم تھے۔ جوش نے نئی راہ نکالی اور اُردو مرثیہ کو عصری حسیت اور تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو بیسویں اور اکیسویں صدی کے لیے بھی لازوال بنا دیا۔ اس طرح سے جوش نے اُردو مرثیہ کی تاریخ کو بے کراں وسعتوں سے ہم کنار کر دیا ہے......اُن کے مرثیے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ انتخاب ''کلامِ جوش'' کے مختلف رنگ و آہنگ کا نمائندہ بن گیا ہے۔ چند نئی نظمیں بھی اس انتخاب میں شامل کر دی گئی ہیں جو اب تک کسی بھی

انتخاب میں نہیں تھیں۔

یقین ہے کہ میرا یہ انتخاب طلبا، اساتذہ اور شائقین ادب کے لیے مفید اور کارآمد ہوگا۔

میں برادر عزیز پریم گوپال متل کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں کہ اُنھوں نے اس انتخاب کی ضرورت اور افادیت کو محسوس کیا اور زیور طبع سے آراستہ کر کے منظر عام پر لے آئے۔ ان کا پبلشنگ ہاؤس کتابت اور طباعت کا اعلا اور ارفع معیار پیش کرتا رہا ہے۔ یہ انتخاب بھی اُن کے ذوقِ نفاست کا آئینہ دار ہوگا۔

بسمل سعیدی مرحوم
ٹونک

منظومات ہدیۂ تہنیت

عنوانِ جلی

تحریر کے عنوانِ جلی فضل امام
تقریر کے والی و ولی فضل امام
اے چشم و چراغ دودمانِ پاکاں
منجملۂ شیعانِ علیؑ فضل امام

☆☆☆

ہدیۂ تہنیت

استاد محترم عالی جناب پروفیسر فضل امام رضوی صاحب
شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی کی خدمت میں
انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس لندن سے مراجعت پر

دوستوں دل شادماں اپنے وطن جے پور میں
آ گئے لندن سے از بس محترم فضلِ امام

۱۹۸۵ء

نتیجۂ فکر:۔ حضرت بصر ٹونکی یکم ستمبر ۱۹۸۵ء

پروفیسر احمد محفوظ
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

نظم در تہنیت
استاذی ومکرمی سید فضل امام رضوی

پھر آج شوق کرے کیوں نہ محفل آرائی
کہ بیٹھے بیٹھے اچانک کسی کی یاد آئی

وہ عین فضلِ خدا پیکر خلوص و وفا
کہ جس کے فیض سے قلب ونظر کی زیبائی

وہ نکتہ سنج و سخن فہم وہ دقیقہ شناس
کہ ہر سخن میں ہے جس کی بلا کی گہرائی

اُسی نگاہ سے اندازِ فکر کو زینت
اُسی نظر سے ہے عرضِ ہنر کو رعنائی

اُسی سے وا ہوئے در اُن پہ علم و حکمت کے
جو جانتے ہی نہ تھے کیا ہے عقل و دانائی

سخن کرے تو بیاں خود نثار ہو اُس پر
جو چپ رہے تو خموشی ہو خود تماشائی

جو اُس کے سائے میں آئے تو خوف کچھ نہ رہا
ڈرا رہی تھی بہت آسماں کی پہنائی

وہ اوستاد مرے ایک نام فضل امام
ہے جن کا فیض مجھے وجہِ عزت افزائی

ازاں خیال کہ محفوظ شد دلم مسرور
بہ حق سپاس گذاری کہ خوش بیارائی

☆☆☆

خوشتر مکرانوی

اعتراف حقیقت

اُدبائے وقت کا جہاں بونا مقام ہے
اُس منزلِ بلند پہ تیرا مقام ہے
اہلِ قلم میں روز یہ ہوتا ہے تذکرہ
اردو ادب کا نام ہی فضل امام ہے

◉

تیرے نفس نے قلب کے غنچے کھلا دئے
تیرے عمل نے کتنی تھکانیں اُتار دیں
وہ آئینہ ہے تیری امامت کے ہاتھ میں
جس نے نقوش عزم کی شکلیں سنوار دیں

◉

تیرے حضور موت نے ماتھا ٹکا دیا
تیرے قلم کی دیکھ کے خوشتر مسافتیں
تاریخ نو نے ثاقبی بانہوں میں لے لیا
اردو ادب پہ دیکھ کے تیری عنایتیں

◉

تقریب تقسیم میکشؔ ایوارڈ، بیادگار حضرت علامہ میکشؔ اکبر آبادی

بخدمت جناب فضل امام رضوی صاحب، ڈی۔ لٹ،

سابق صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

قطعۂ تاریخ تہنیت

شہرِ ادب میں اس کا ہے، آج خیر مقدم
خدمات ہیں نمایاں اردو ادب میں جس کی
سرشار ہے وہ قبلہ میکشؔ کے میکدے میں
تھی روح جس کی اُلفت کے جام کی پیاسی
دریائے علم اس کو کہئے تو کیا غلط ہے
جب بابِ علم، تک ہے موصوف کی رسائی
اقلیم شاعری کا اک شہر یار ہے جو
نقاد دیدہ ور ہے وہ صاحب قلم بھی
ہندی زباں سے بھی ہے جس کو دلی لگاؤ
وہ ہے خلوصِ دل سے اُردو زباں کا حامی
تحریر میں بھی جس کی ہے بانکپن نمایاں
دیتا ہے زیب اس کو اندازِ کج کُلاہی
تدریس کے چمن میں وہ ذی حشم مدرس
تسلیم ہے جہاں کو جس کی زبان دانی

صحنِ چمن میں وہ بھی اک دیدہ زیب گل ہے
اپنے وطن کی زینت بعد از جناب تجلّی
پایا ہے آج اُس نے اعزاز اُن کے در سے
اُردو زباں ہے جن کے قصرالادب کی باندی
طیبؔ سخن بجا ہے اُن کو جو آج کہئے
اُردو ادب کے محسن فضل امام رضوی

۲۰۰۸ء

نتیجۂ فکر طیب علی کاظمی
بمقام گرانڈ ہوٹل، آگرہ کینٹ
تاریخ ۲۰ر اپریل ۲۰۰۸ء بروز اتوار

بحسن اہتمام:-
اراکین بزم میکش، آگرہ

☆☆☆

ہدیۂ تہنیت

بخدمت عالی جناب استاد محترم پروفیسر سید فضل امام رضوی

کیوں نہ ہو جائے زلیخا تجھ پہ اُردو کی نثار

جس پہ ہو فضل خدا، فضل نبی، فضل امام
صدر شعبہ ہو نہ وہ کیوں کر مثالِ احتشام

امن عالم ہے عیاں بس علم کے عنوان سے
علم ہی سے جی رہے ہیں دہر میں ہم شان سے
علم کیا ہے اس کی عظمت پوچھیۓ قرآن سے
علم کرتا ہے الگ انسان کو حیوان سے

علم ہی سے فیض اور اقبال کا ہے احترام
علم ہی سے حاصل محفل ہیں یاں فضل امام

فارسی، عربی ہو یا ہندی زباں کی ہو ڈگر
تیری ان سب پر یقیناً ہے برابر کی نظر
صرف اُردو کے لیے تو نے کیا خونِ جگر
کیا بھلا پائیں گے قربانی تری اہل نظر

تیری ہستی سے ادب کے گلستاں میں ہے بہار
کیوں نہ ہو جائے زلیخا تجھ پر اردو کی نثار

ہے فنِ تنقید اور تحقیق سے تو ذی وقار
نظم کی دنیا پہ مضموں کا ہے تیرے اقتدار

بر سرِ منبر ترا ہر لفظ پیغامِ بہار
نازکی ایسی کہ جیسے پھول پر شبنم نثار

جلوۂ علم و ہنر ضوبار ہے ہر سو ترا
دین و دنیا کے ہر اک مضموں پہ ہے قابو ترا

تیری تقریروں سے ہوتا ہے مسلسل یہ عیاں
تجھ میں پنہاں درحقیقت علم کا ہے اک جہاں

لفظ مثل نجم ہر تحریر میں ہے ضو فشاں
تیری تحریریں ہیں کاغذ پر مثال کہکشاں

تیری تحریر و خطابت میں انوکھی شان ہے
مختصر یہ ہے کہ دونوں ہی ترا میدان ہے

گفتگو ہندی میں کر کے تو نے یہ بتلا دیا
متحد ہونے کا یہ بھی ہے انوکھا راستہ

ہو کے اُردو کا معلم تو نے یہ ثابت کیا
درمیاں ہندی اور اُردو کے نہیں کچھ فاصلہ

تیری تقریروں سے ہندی کا جہاں آباد ہے
ایسا لگتا ہے کہ ہندی کا بھی تو اُستاد ہے

حسن اور اخلاق کی پہچان ہے فضل امام
فہم اور ادراک کی اک شان ہے فضل امام
شاہِ دیں کا تابع فرمان ہے فضل امام
مختصر یہ ہے کہ اک انسان ہے فضل امام
زیست میں نایابؔ یوں ایثار ہونا چاہئے
اس ترقی کے لیے دیں دار ہونا چاہئے

پیش کردہ:- نایاب سحر بلیاوی
بتاریخ ۲۸/اگست ۲۰۰۱ء

شعبۂ اُردو
الہ آباد، یونیورسٹی
الہ آباد

ڈاکٹر شاداب قدیر

استاذ معظم و محترم

پروفیسر سید فضل امام رضوی

کی خدمت میں

خود آگہی کو ناز ہے جن کے وجود پر
جو مفتخر نہیں رہے نام و نمود پر
قانع رہے ہمیشہ جو تقلیل و زود پر
رقصاں ہیں جن کے زمزمے دل کی سرود پر
گفتار کے دھنی ہیں وہ کردار کے امام
علم و ادب کے شہر میں روشن ہے ان کا نام

تہذیب پر نگاہ بھی، تاریخ کا شعور
ہے نازکی بھی فکر میں ، جذبات کا وفور
افکار عہد نو کا ہے آنکھوں میں گرچہ نور
ہے بادۂ کہن کا مگر آج بھی سرور
ہیں منکسر مزاج طبیعت غیور بھی
الفاظ اور بیان پہ اُن کو عبور بھی

مشفق بھی ہیں، شفیق بھی، یاروں کے یار بھی
اقلیم علم و فن کے وہی شہریار بھی
وہ حاصل خزاں بھی ہیں، فخرِ بہار بھی
بیشک وہی ہیں نادرۂ روزگار بھی
پرچم ادب کا لے کے جدھر کو نکل گئے
تنقید و آگہی کی فضا کو بدل گئے

سرمایۂ علومِ ادب کے امیں ہیں وہ
ہو کے فلک وقار بروئے زمیں ہیں وہ
دریائے انتقاد کا دُرِ ثمیں ہیں وہ
شہر ادب میں دیکھا جہاں پر وہیں ہیں وہ
وہ پیکرِ عمل ہیں تحرک نہاد ہیں
وہ تو حریف سلسلۂ انجماد ہیں

وہ ہیں اسیرِ فکر، ادب کے رئیس بھی
حساس ذہن و دل ہیں، طبیعت نفیس بھی
ہمدرد و غمگسار، خلیق و انیس بھی
پیچیدہ گفتگو میں ادائے سلیس بھی
اُن کے تفکرات کا قائل تو میں بھی ہوں
اُن کے درِ علوم کا سائل تو میں بھی ہوں

پروفیسر فضل امام کی دیگر کتب

❀ اُردو : (مطبوعہ)

۱۔ امیر اللہ تسلیم : حیات اور شاعری (تحقیقی مقالہ برائے۔ پی ایچ۔ ڈی)

۲۔ مثنوی نجرِ عشق : تسلیم لکھنوی (ترتیب و مقدمہ)

۳۔ بھوجپوری ادب کا تعارف (تاریخ)

۴۔ جدید ہندی شاعری : سمت و رفتار (تنقید)

۵۔ مثنوی نغمۂ مسلسل یا گوہر انتخاب (ترتیب و مقدمہ)

۶۔ افکار و نظریات (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

۷۔ انیس شناسی (مجموعۂ مضامین)

۸۔ موازنۂ انیس و دبیر : شبلی نعمانی (ترتیب و مقدمہ)

۹۔ انیس: شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔ لٹ)

۱۰۔ شاعر آخر الزماں: جوش ملیح آبادی (تنقید)

۱۱۔ مشرقی انتقادیات : اصول و نظریات (تنقید)

۱۲۔ انتخاب کلام حسرت موہانی (انتخاب و مقدمہ)

۱۳۔ تذکرہ جلوۂ خضر : صفیر بلگرامی (ترتیب و مقدمہ)

۱۴۔ سیف و سبو : جوش ملیح ابادی (ترتیب و مقدمہ)

۱۵۔ دیوانِ درد کا نقشِ اوّل (تحقیق، ترتیب و مقدمہ)

۱۶۔ اُردو شناسی (قواعد و املا)

۱۷۔ راجستھانی زبان و ادب : ایک تعارف (تاریخ و تحقیق)
۱۸۔ امعانِ نظر ۱۹۔ تنقیدی معیار
۲۰۔ مطالعۂ عارف ۲۱۔ جدید مرثیہ ۲۲۔ علامہ اقبال کی اساسِ فکر

☆☆☆
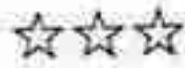
❀ اُردو : (مذہبی) (مطبوعہ)

۱۔ شریکۃ الحسین (۱) ۱۹۹۶
۲۔ شریکۃ الحسین (۲) (غیر مطبوعہ)
۳۔ اقبال اور اہلِ بیت (غیر مطبوعہ)

☆☆☆

❀ ھندی : (مطبوعہ)

۱۔ اردو ساہتیہ : ایک جھلک — उर्दू साहित्य एक झलक
۲۔ پاکستان کا پرتِ رودھی اردو ساہتیہ — पाकिस्तान का प्रतिरोधी उर्दू साहित्य
۳۔ انتخاب کلامِ جوش — इन्तिख़ाबे कलामे जोश
۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد — मौलाना अबुल कलाम आज़ाद
۵۔ تازہ ہوا۔ باقر نقوی (ترجمہ) — ताज़ा हवा–बाक़र नक़वी
۶۔ مسلمانوں کی سمیائیں (غیر مطبوعہ) — मुसलमानों की समस्यायें

☆☆☆

❀ انگریزی : ENGLISH

1 : CENTRAL ASIA ------- Past and Present

2 : URDU GHAZAL -------- An Introduction

❀❀❀

عالی جناب
سید مشتاق حسین صاحب
مرحوم و مغفور
پروفیسر فضل امام
کے
والد ماجد

عالی جناب
سید انوار الحسن صاحب کربلائی
مرحوم و مغفور
پروفیسر فضل امام
کے
خسر معظم

پروفیسر فضل امام
حج بیت اللہ کے ارکان ادا کرتے ہوئے

ممتاز شاعر، ادیب اور نقاد علی سردار جعفری کے ساتھ جے پور کے کل ہند
انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں

صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما سے ہندوستانی اکادمی، الہ آباد کا
انعام لیتے ہوئے

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے
اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام لیتے ہوئے

وزیر اعلیٰ اتر پردیش اکھلیش یادو سے اتر پردیش اردو اکادمی کا
انعام لیتے ہوئے۔ ساتھ میں ڈاکٹر نواز دیوبندی (چیئرمین اکادمی)

جید سماج وادی مفکر جنیشور مشرا کے ساتھ ناشتے پر
اپنے بنگلے ۱۰-اے بینک روڈ۔ الہ آباد

جناب ملائم سنگھ یادو سماج وادی پارٹی کے مکھیا سابق وزیر اعلیٰ
اتر پردیش اور سابق وزیر دفاع حکومت ہند کے ساتھ

یو۔پی۔ سکنڈری ایجوکیشن کمیشن الٰہ آباد میں اس وقت کے
وزیر تعلیم سکھ دیوراج بھر کے ساتھ

شعبۂ اردو کی تعمیر جدید کے افتتاح کے موقع پر

ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ، جے پور

اتر پردیش سکنڈری ایجوکیشن کمیشن، الٰہ آباد میں دفتر جاتے ہوئے

سابق ایڈوکیٹ جنرل مشہور وکیل ہائی کورٹ الٰہ آباد
جناب محمد علی کاظمی مرحوم کے ساتھ

ممتاز سماج وادی مفکر جنیشور مشرا کے ساتھ الٰہ آباد میں

پروفیسر ریتا بہوگنا جوشی کے ساتھ

بین الاقوامی سیمینار "احتشام حسین اور جدید اردو تنقید" کے اجلاس میں
تقریر کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد عقیل و پروفیسر محمود الحسن رضوی کے ساتھ

انجمن طبقہ سادات و مومنین کے سالانہ اجلاس میں
نائب صدر کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے

بین الاقوامی جوش ملیح آبادی سیمینار میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے
اسٹیج پر شمس الرحمن فاروقی اور نیر مسعود رضوی
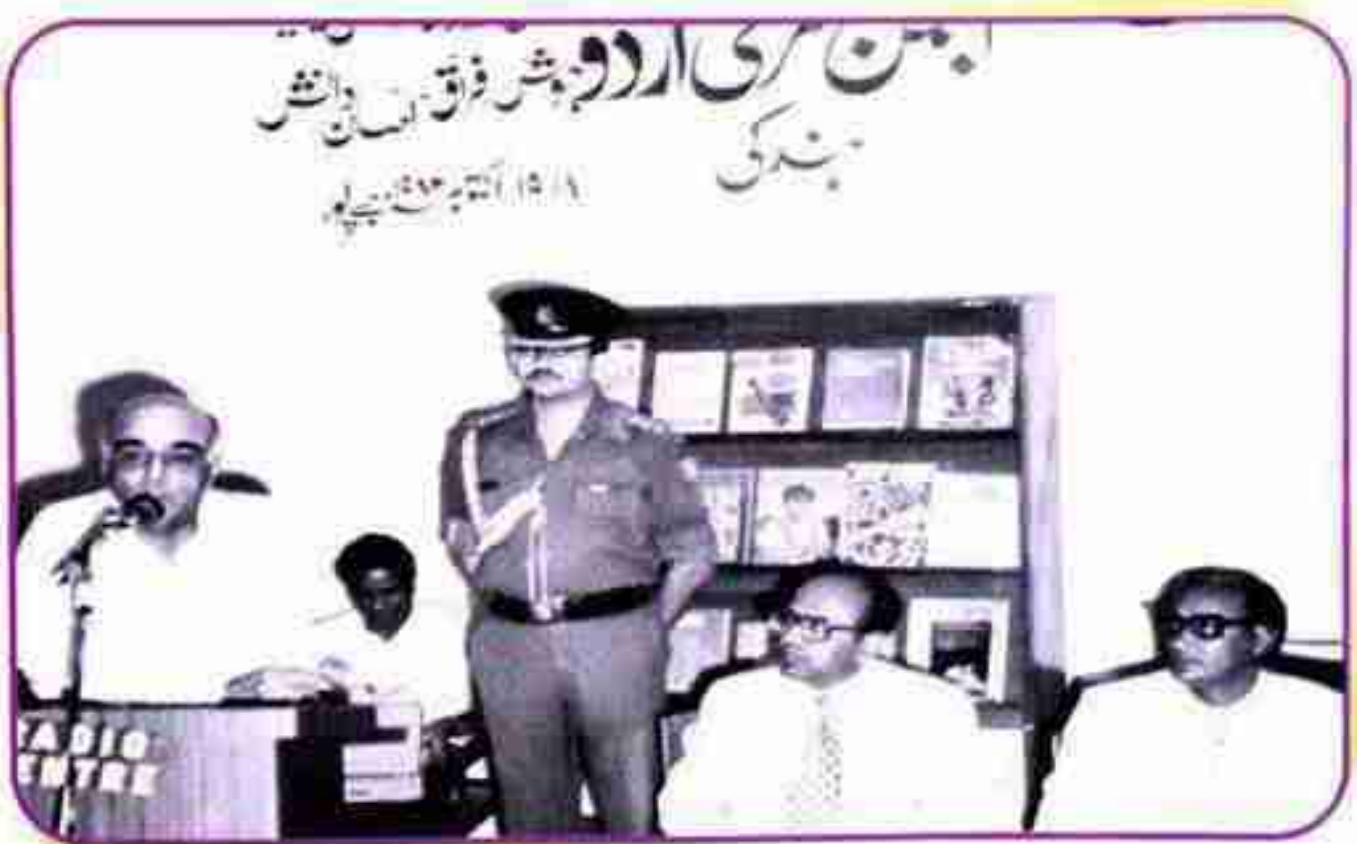
انجمن ترقی اردو ہند کے بین الاقوامی سیمینار میں گورنر راجستھان
او۔ پی۔ مہرا افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ساتھ میں جناب شاہ انعام الحق،
صدر انجمن، پروفیسر فضل امام جنرل سکریٹری مقام انفارمیشن سینٹر، جے پور

شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے صدر کے عہدے کی تقریب میں
شری رام برچھ یادو ایم۔ ایل۔ سی تہنیت دیتے ہوئے

مشہور ترقی پسند مفکر، نقاد اور ادیب
سید سبط حسن مرحوم کے ساتھ

مشہور شاعر جناب مجروح سلطانپوری سے گفتگو کرتے ہوئے
آل انڈیا ریڈیو۔ اسٹوڈیو۔ الہ آباد

پروفیسر محمود الہی۔ فراق گورکھپوری۔ پروفیسر رگھو ویر سنگھ۔
پروفیسر فضل امام اور پروفیسر افغان اللہ خاں

شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی
میں علی سردار جعفری کا
استقبال کرتے ہوئے
پروفیسر فضل امام
ساتھ میں سلطانہ جعفری

ساہتیہ اکادمی، دہلی کے
علی سردار جعفری سیمینار
میں آخری اجلاس کی
صدارت کرتے ہوئے،
ساتھ میں پروفیسر انور پاشا
اور
نصرت ظہیر
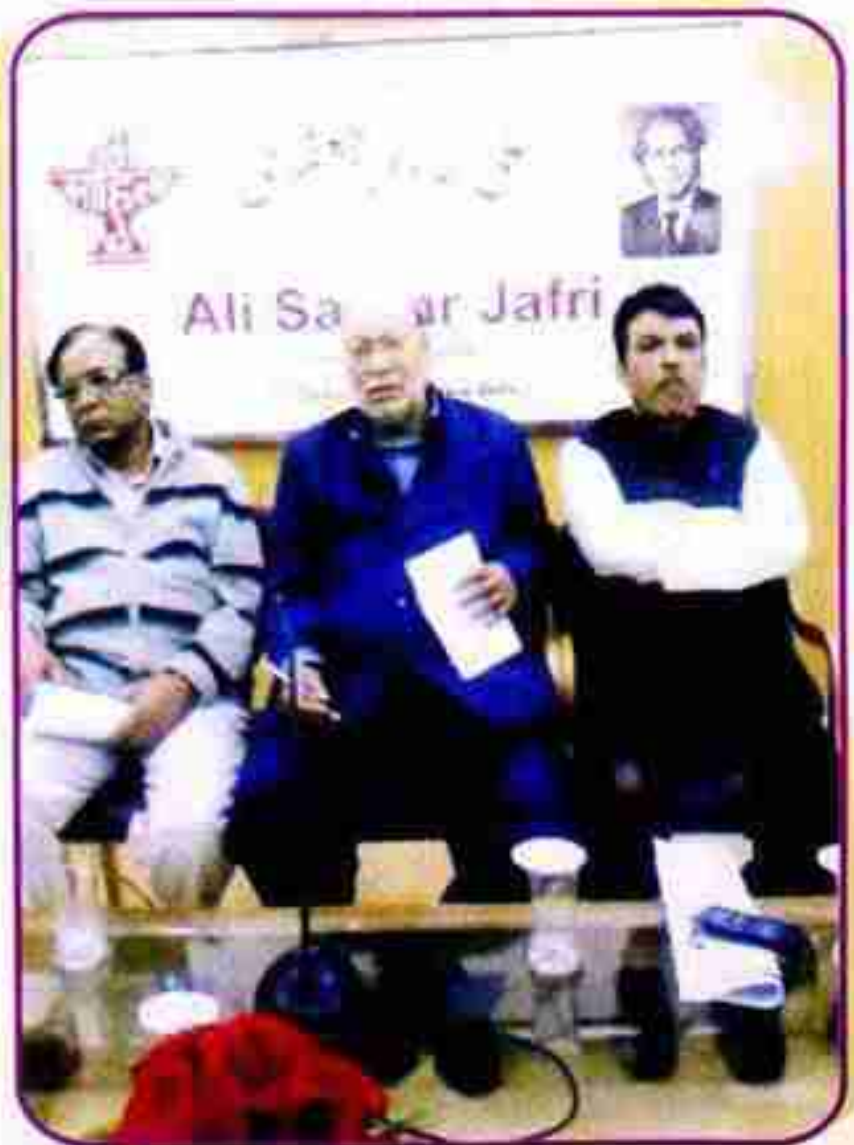
سالانہ تاریخی
جلسۂ سیرت النبی
کو خطاب کرتے ہوئے
ہمدرد دواخانہ،
رام گنج بازار، جے پور
(راجستھان)

عالمی افسانوی ادب
سیمینار
اودے پور یونیورسٹی
میں
تقریر کرتے ہوئے

رگھوپتی سہائے
فراق گورکھپوری
کے ساتھ
گورکھپور یونیورسٹی میں

انجمن ترقی پسند مصنفین
الہ آباد کانفرنس میں
مشہور ہندی شاعر
سوریہ کانت ترپاٹھی
پر مقالہ پڑھتے ہوئے۔
کیفی اعظمی
بیٹھے ہوئے ہیں

انجمن ترقی
پسند مصنفین کی
گولڈن جبلی لندن
میں مقالہ پڑھتے ہوئے

مہارانی لال کنور پی۔ جی۔ کالج بلرام پور گونڈہ میں اتر پردیش کے گورنر
اکبر علی خاں کو کالج لائبریری کے گراں قدر قلمی نسخوں سے متعارف کرتے ہوئے۔

Prof. Fazl Imam : Adabi Safar ke Sath Saal
Edited By : Dr. Shabih Sughra

پروفیسر فضل امام

مستند ناقدین کی نظر میں

"آپ کی گراں قدر تصنیف، "امیر اللہ تسلیم..... حیات اور شاعری" پڑھی آپ بہت جم کر اور ڈٹ کر کام کر رہے ہیں۔ آپ بہت کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے مضامین میں ہندی اور راجستھانی سے متعلق کئی چیز اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

☆.................ڈاکٹر گیان چند جین

"ڈاکٹر فضل امام نے "امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے بہت بڑی کمی پوری کی ہے ان کا اندازِ تحقیق و تنقید معتبر اور دل نشین ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔"

☆.................مشفق خواجہ

ڈاکٹر فضل امام ہمارے ان معتبر محققین و ناقدین میں ہیں جن کے قلم میں بڑا وزن و وقار ملتا ہے چنانچہ راجستھانی زبان و ادب کے بارے میں بھی انھوں نے ہم اُردو والوں کی بے علمی کو علم میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جزاک اللہ۔

☆.................پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اردو تنقید نے ہنوز انیس کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی تازہ تصنیف میں انیس کے فن کا نئے زاویے سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر متوازن ہے تعصبات اور تاثرات کو صرف رائے زنی کے طور پر رنگین جملوں اور چٹ پٹے فقروں میں بیان کرنے کے بجائے وہ سنجیدہ مطالعے کے عادی ہیں اور اپنے خیالات کو دلیل اور ثبوت سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں۔

☆.................ڈاکٹر محمد حسن

پروفیسر فضل امام کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے ہمیشہ مطمئن رہا ہوں۔ دیوانِ درد کا نقش اوّل اور امیر اللہ تسلیم کی دو نایاب مثنویوں کی ترتیب و تدوین ان کا گراں قدر کارنامہ ہے۔ فراق کی تنقید نگاری پر ان کا مقالہ کئی نئے ابعاد کا حامل ہے اور دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ کسی بھی ادب پارے کے ذیل میں ان کے استخراج نتائج مدلل ہوتے ہیں۔

☆.................پروفیسر محمود الٰہی

ڈاکٹر فضل امام۔ تحریر و تقریر دونوں کے دھنی ہیں۔ میں نے ان کی تقاریر اور مقالے بطور خاص پیش نظر رکھے ہیں۔ جس میں استدلال اور استنباط سے کام لیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

☆.................پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

Kakori Print Services # 9795097634